

سید مبارک شاہ کے کلام میں تصوف کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ

مقالہ

برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار:

رختاج بی بی



فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری، ۲۰۲۱ء

سید مبارک شاہ کے کلام میں تصوف کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ

مقالہ نگار:

رختاج بی بی

یہ مقالہ

ایم۔ فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجس

(اردو زبان و ادب)



نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجس، اسلام آباد

جنوری، ۲۰۲۱ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: "سید مبارک شاہ کلام میں تصوف کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ"
پیش کار:- رختاج بی بی رجسٹریشن نمبر: 1458/M/U/S18

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر صائمہ ندیر

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر صوفیہ لودھی

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان

پروریکٹر اکیڈمکس

تاریخ:

اقرارنامہ

میں، رختاج بی بی حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم فل سکالرشپ کی حیثیت سے ڈاکٹر صائمہ نذیر کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

رختاج بی بی

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

صفحہ نمبر	عنوان
iii	مقالے کے دفاع کی منظوری کا فارم
iv	اقرارنامہ
v	فہرست ابواب
vii	Abstract
viii	اظہار تشکر
۱	باب اوّل: موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث
۱	تمہید
۱	i۔ موضوع کا تعارف
۱	ii۔ بیان مسئلہ
۲	iii۔ مقاصد تحقیق
۲	iv۔ تحقیقی سوالات
۲	v۔ نظری دائرہ کار
۲	vi۔ تحقیقی طریقہ کار
۳	vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق
۳	Viii۔ تحدید
۴	ix۔ پس منظر کی مطالعہ
۴	x۔ تحقیق کی اہمیت
۴	ب: سید مبارک شاہ کی حیات
۲۱	ج: بنیادی مباحث

۲۱	i۔ تصوف
۶۲	باب دوم: سید مبارک شاہ کی غزلیات
۶۸	۱۔ وحدت الوجود اور تصور خدا یا عرفانِ ذاتِ الہی
۷۱	۲۔ خدا اور انسان کا تعلق، عبادت خالق سے تعلق کا ذریعہ
۷۸	۳۔ بے ثباتی عالم
۸۳	۴۔ حساسیت
۸۹	۵۔ منصور حلّاج
۹۲	باب سوم: سید مبارک شاہ کی نظموں کا مزاج
۹۹	۱۔ حمد
۱۰۱	۲۔ نعت
۱۰۳	۳۔ قصیدہ
۱۰۹	۴۔ خدا اور انسان کا تعلق
۱۱۴	۵۔ عرفانِ ذاتِ الہی
۱۱۸	۶۔ بے ثباتی
۱۲۴	۷۔ منصور حلّاج
۱۳۳	۸۔ حساسیت اور معاشی بے حسی
۱۴۰	بابِ چہارم:- (مجموعی جائزہ) ماحصل
۱۴۱	الف۔ ماحصل
۱۵۳	ب۔ نتائج
۱۵۴	ج۔ سفارشات
۱۵۵	کتابیات: بنیادی مآخذ / ثانوی مآخذ

Abstract

The subject of my proposed dissertation is "Elements of Sufism in Syed Mubarak Shah's Kalam: Analytical Study". All his poetry has been collected at one place named as "Kulyat Mubarak Shah". The general impression is that poetry is the heritage of sensitive people and it is not just for everyone. In poetry, delicate ideas are presented to the reader in such a way that they have their own feelings and thoughts, and the poet presents his feelings and emotions so skillfully that the reader finds them his own experiences, where this impression is lacking. The right of poetry will not be paid there. Syed Mubarak Shah's poetry seems to be a perfect reflection of his personal experiences. The quality of this impression is also found in the following. He is counted among the poets of the eighties. And a large and significant part of his poetry is with reference to Sufism, which can only be understood after reflection. In this article and research, an attempt has been made to bring out the same color of Sufism in the words of Syed Mubarak Shah and to offer it to the readers. What is Sufism? What is his soul? What are the feelings and observations of Sufis? And what is the thinking of Sufis? And in the case of Syed Mubarak Shah, these observations and sentimental colors have been explained in this article. And what are the word restrictions in Syed Mubarak Shah's poetry and in what way are the observations and feelings are express and how much the readers are impressed by them. Syed Mubarak Shah's words have been used to the fullest to complete the research work and information has been gathered through interviews with his family and friends to bring his living conditions before the readers. Journals and newspaper were also useful and helpful. Essays and books on Sufism have been resorted to and thus the subject has been brought to light in a traditional way and its presence in the poetry of Syed Mubarak Shah. And every possible effort has been made to discuss the other virtues of Syed Mubarak Shah's poetry but Sufism and the color of Sufism have been brought to the fore especially in Syed Mubarak's poetry. In this regard, the subject has been expanded by describing the ghazal and the poem separately.

اظہارِ تشکر

مقالے تکمیل کے لیے سب سے پہلے میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی شکر گزار ہوں جس کے کرم اور رحمت کی وجہ سے آج میں اپنے مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکی ہوں۔ میں شکر گزار ہوں صدر شعبہ اردو پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم، کوآرڈینیٹر صائمہ نذیر اور انتہائی واجب الاحترام اساتذہ کی جن کا دستِ شفقت ہر لمحہ اور ہر پل میرے سر پر رہا۔ میں بالخصوص اپنی نگران اور محسن ڈاکٹر صائمہ نذیر کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے میری رہنمائی کی اور قدم قدم پر میری اصلاح کا کام کرتی رہیں اور منزل مقصود کے حصول میں میری رہنمائی کرتی رہیں۔

دراصل ان کی حوصلہ افزائی نے میری ہمت بڑھائی اور میرے ارادوں کو استحکام اور رفعت ملی۔ دوسری جانب حصول کتب میں انہوں نے میری کماحقہ مدد کی۔

میں اپنے تعلیمی مدارج کے حصول میں اپنی کامیابی کے لیے اللہ کی ذات کے بعد اپنے والدین اور اپنے ایک محسن ڈاکٹر مظہر عظیم صاحب کی تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں۔ آج میں جس مقام پہ ہوں میری یہ تمام کامیابیاں اور تمام کامرانیاں انہیں تین افراد کی مرہونِ منت ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو آج میں علم کے نور سے محروم انسان ہوتی۔ میرے والدین ناخواندہ افراد ہیں۔ لیکن انہوں نے میری تعلیم میں خصوصی دلچسپی لی اور آج ان کی اس دلچسپی اور ڈاکٹر مظہر عظیم صاحب کی رہنمائی سے مجھے اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر پہنچایا۔ اللہ سے خلوص نیت اور دل کی گہرائیوں سے دعا ہے کہ اللہ ان کی مساعی کو قبول فرمائے۔ اور مجھے ان کے لیے صدقہ جاریہ ثابت کرے۔ میرے والد اس دنیا میں اب نہیں ہیں انہیں اللہ اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور میری ماں اور میرے محسن ڈاکٹر عظیم صاحب کو اللہ صحت و عافیت والی زندگی عطا کرے اور اللہ انہیں اور لوگوں کے لیے بھی فرشتہ رحمت بنائے۔

رختاج بی بی

سکالراہم۔ فل اردو

باب اول

موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید

i- موضوع کا تعارف:

میرے ایم۔ فل کے مقالے کا موضوع "سید مبارک شاہ کے کلام میں تصوف کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ" ہے۔ ان کی کلیات میں ان کا تمام کلام مجتمع ہے۔ شاعری حساس فرد کا ورثہ ہے اس لیے شاعری ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ شاعری میں نازک خیالات کو اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ قارئین کو لگتا ہے کہ:

گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

شاعر اپنے ذاتی تجربات اور احساسات کو کمال مہارت سے الفاظ کا تانا باناؤں کے اس طور پیش کرتا ہے کہ اس کی بات پڑھنے والے کو اپنا ہی تجربہ لگتا ہے۔ جہاں اس تاثر کا فقدان ہو گا تو وہاں شاعری کا حق کما حقہ ادا نہیں ہو گا۔ سید مبارک شاہ کے کلام میں ذاتی تجربات کی عکاسی اور اس کے اثر کی صفت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اُن کا شمار ۸۰ کی دہائی کے شعراء میں ہوتا ہے اور اُن کے کلام کا ایک بڑا اور قابل ذکر حصہ تصوف کے حوالے سے ہے جسے غور و فکر کے بعد ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

ایم۔ فل کے اس مقالے میں سید مبارک شاہ کے کلام میں تصوف کے اسی رنگ کو منظر عام پر لانے اور قارئین کی نذر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

تصوف کیا ہے؟ اس کی روح کیا ہے؟ اس عقیدے کے حامل افراد کی محسوسات اور مشاہدات کیا ہیں؟ اور اہل تصوف کی سوچ کیا ہوتی ہے؟ ان موضوعات کے حوالے سے اس مقالے میں مواد شامل کیا گیا ہے۔ اور یہ کہ سید مبارک شاہ کے ہاں یہ احساسات اور مشاہدات کن رنگوں کے حامل ہیں۔

ii- بیان مسئلہ:

سید مبارک شاہ ۸۰ کی دہائی کے اہم شعراء میں گردانے جاتے ہیں۔ شعری اور ادبی حلقوں میں ان کی ایک منفرد و یکتا شناخت ہے۔ ان کے کلام کا خاصا تصوف کا وجود ہے۔ اسی غرض سے اس موضوع پر تحقیق کی گئی ہے۔

iii۔ مقاصدِ تحقیق:

زیر نظر تحقیق میں درج ذیل مقاصد پیش نظر ہیں:

- ۱۔ سید مبارک شاہ کی شاعری کی انفرادیت کو منظر عام پر لانا۔
- ۲۔ تصوف کے عناصر سے نئی نسل کو متعارف کروانا۔
- ۳۔ سید مبارک شاہ کی شاعری میں تصوف کے عناصر کا تجزیہ کرنا۔

iv۔ تحقیقی سوالات:

- ۱۔ تصوف سے کیا مراد ہے؟
- ۲۔ تصوف کے عناصر کیا ہیں؟
- ۳۔ سید مبارک شاہ کے ہاں تصوف کا انداز کیا ہے؟
- ۴۔ سید مبارک شاہ کے ہاں تصوف کے عناصر کی موجودگی اور شاعری کی روایت سے ہم آہنگی؟

v۔ نظری دائرہ کار:

زیر نظر تحقیقی موضوع "سید مبارک شاہ کے کلام میں تصوف کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ" کے پیش نظر سید مبارک ان کے انداز اور لفظی بندشوں اور قارئین کو متاثر کرنے والے عناصر کا جائزہ لیا گیا ہے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار:

زیر نظر مقالے میں سید مبارک شاہ کے کلام سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ثانوی ماخذات میں دیگر کتب کے ساتھ ساتھ ان کے دوست احباب اور ان کے اہل خانہ سے لیے گئے انٹرویوز کو بھی معاونت کے لیے شامل کیا گیا ہے۔ سید مبارک شاہ کے رفقاء کی آراء کو بھی شامل کیا گیا ہے اور ان کے حالاتِ زندگی کو ضبطِ تحریر میں لانے میں ان تمام ذرائع سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں رسائل و جرائد و اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین سے بھی مدد لی گئی ہے۔ تصوف کے حوالے سے دیگر کتب اور مقالہ جات سے بھی خاطر خواہ مدد لی گئی ہے۔ اور اس طرح تصوف اور اس کے مفہوم اور سید مبارک شاہ کے کلام میں اس موضوع کے حوالے سے متنوع شاعری کو منظر عام پر لانے کی سعی کی گئی ہے۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق:

سید مبارک شاہ کا نام ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں اور ان کا کلام وقتاً فوقتاً مطالعہ کے لیے منتخب کیا جاتا رہا ہے۔ ایم۔ اے کی سطح پر "جنگل گمان کے" جوان کی شاعری کی کتاب ہے اس پر سعدیہ عاشق صاحبہ نے نمل یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے زیر نگرانی تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ اس مقالے میں ان کے کلام کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن یہ ابتدائی نوعیت کا کام ہے، اور صرف ایک کتاب پر تحقیق ہے۔ اس کے علاوہ منہاج یونیورسٹی لاہور کے طالب علم محترم ذیشان صاحب "کلیات مبارک شاہ کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے مقالہ تحریر کر رہے ہیں جو سال ۲۰۲۱-۲۰۱۹ء کے دورانیہ میں تحریر ہو گا۔

اسی طرح اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد کے طالب علم شاہد بلال صاحب نے سید مبارک شاہ کی شاعری پر ۲۰۲۰ء میں تحقیق مکمل کی ہے ان کے مقالے کا عنوان ہے "سید مبارک شاہ کی شاعری کا موضوعاتی مطالعہ" اور یہ ایم۔ فل کی سطح پر کی گئی تحقیق ہے۔

کاشف علی، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد نے بھی ایم۔ اے کی سطح پر سید مبارک کی شاعری کو تحقیق کا موضوع بنایا ہے ان مقالے کا عنوان ہے "سید مبارک شاہ کی شاعری مابعد جدید تناظر میں" اور یہ مقالہ ۲۰۲۰ء میں مکمل کیا گیا ہے۔

"مدارِ نارسائی میں (سید مبارک شاہ) کا تجزیاتی مطالعہ" کے عنوان سے سیشن ۲۰۱۰ء تا ۲۰۱۲ء میں گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج، بہاولپور کے شعبہ اردو اقبالیات زیر نگرانی محمد ارشد صاحب نے سید مبارک شاہ کی شاعری پر تحقیق کا کام مکمل کیا ہے۔

ان کے کلام میں دیگر موضوعات کو منظر عام پر لانے کی غرض سے یہ تحقیق معرض وجود میں لائی گئی

ہے۔

viii۔ تحدید:

سید مبارک شاہ کی شاعری ادبی حلقوں میں اور ادب سے لگاؤ رکھنے والوں کے لیے نئی نہیں ہے۔ میرے ایم۔ فل کے مقالے کا مقصد بھی ان کے کلام کی رنگارنگی میں تصوف کے موضوع کی تلاش رہی ہے اُن کا کلام جو نہ صرف انفرادی صورت میں شائع ہو چکا ہے بلکہ ۲۰۱۷ء میں کلیات کی صورت میں بھی شائع ہوا ہے تو ان کے کلام اور کلیات کو شامل تحقیق کیا گیا ہے اور اس تحقیقی مقالے کو تحریر کیا گیا ہے۔

ix۔ پس منظری مطالعہ:

پس منظری مطالعہ کی صورت میں تصوف کا مفہوم، اس کے عناصر، تعارف اور اردو شاعری میں تصوف کی روایت اور اس کی صورتیں جاننے کے لیے مختلف کتب، مضامین اور تبصروں سے استفادہ کیا گیا ہے اس سلسلے میں از ابو الاعجاز حفیظ صدیقی تصوف کا انسائیکلو پیڈیا مترجم محمد عبدالنصیر بن عبدالصیر علوی، ڈاکٹر رضا حیدر کی کتاب "اردو شاعری میں تصوف اور روحانی اقدار"، ڈاکٹر نفیس اقبال کی کتاب "تصوف اور ادب کا باہمی رشتہ"، سلمیٰ کبریٰ صاحبہ کا مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی اور ان کے دوست سلطان ناصر کا مضمون "تیسرے جہان کی تلاش" اور کلیات سید مبارک شاہ سے مکمل استفادہ و معاونت حاصل کر کے فریضہ تحقیق کی بجا آوری عمل میں آئی۔

x۔ تحقیق کی اہمیت:

سید مبارک شاہ کا کلام اور ان کا نام ادبی حلقوں میں معروف اور جانا پہچانا ہے ان کے کلام کی چاشنی و تاثیر کسی سے مخفی نہیں۔ ان کے کلام میں قارئین کو متاثر کرنے کی صفت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس تاثیر اور چاشنی کے ہمراہ ان کے کلام کی دیگر اور خاص صفات جن میں تصوف بھی اہم ہے۔ اسے قارئین کے سامنے لانے کی مد میں یہ تحقیق منظر عام پر لائی گئی اور یہی مقصد پیش نظر رکھ کر یہ مقالہ ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔

ب: سید مبارک شاہ کی حیات:

شاعری حساس افراد کا ورثہ ہے اسی لیے شاعر معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے۔ یہ ہر کس و ناکس کی بات نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ الفاظ میں ایسا جادو پنہاں ہوتا ہے کہ یہ انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ یہ جادو اور منتر حاصل کرنے کے لیے بعض لوگ در در کی خاک چھانتے ہیں۔ بہت سارے لوگوں سے کسب فیض کرتے ہیں تب جا کے اس فن میں کمال اور مہارت کے حقدار ٹھہرتے ہیں اور اس جستجو اور کھوج میں وہ اپنا وجود تک کھودیتے ہیں جبکہ کچھ لوگوں کے ساتھ معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے وہ ایسے کہ وہ پہچان بن جاتے ہیں "الفاظ کی" سید مبارک شاہ کی شخصیت بے شمار دیگر صفات کے ساتھ ساتھ الفاظ کی پہچان کا ذریعہ ٹھہری آپ کی تمام تر زندگی کا آغاز ہی الفاظ کی، پہچان سے ہوا۔ کوئی بھی شاعر کیونکہ احساس کو رقم کرتا ہے۔ لہذا وہ احساسات و ذاتی تجربات کو کمال مہارت سے الفاظ کے تانے بانے سے بن کر پیش کرتا ہے اور اس مہارت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ قارئین کو لگتا ہے جو تجربات شاعر پیش کر رہا ہے وہ اسی کا ذاتی تجربہ ہے کہیں بھی اس تاثر میں کمی یا فقدان نظر آئے وہاں شاعری کو جو حق ہے وہ ادا نہیں ہو گا تاثر کا یہ

رنگ سید مبارک شاہ کے کلام میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ سید مبارک شاہ نے شاعری اور نثر دونوں میدانوں میں اپنے قلم کا خوب جادو جگایا ہے۔

سید مبارک شاہ ایک خوب رو، پاکیزہ خیالات کے مالک اور صاف طبیعت کے حامل انسان تھے۔ ان کی ذات میں موجود تمام کے تمام اوصاف ان کلام میں با آسانی دیکھے جاسکتے ہیں سید مبارک شاہ کا شمار ۸۰ کی دہائی کے شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ کے بعد قارئین کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے کلام میں ایک قابل ذکر حصہ تصوف پر مبنی ہے لیکن اس حقیقت تک رسائی کے لیے غور و فکر کی ضرورت ہے۔

خاندانی پس منظر:

سید مبارک شاہ کا تعلق کشمیر سے تھا آپ کے بزرگوں اور آباؤ اجداد کے بارے میں معلوم یہ ہوا ہے کہ وہ ایران کے علاقے ہمدان سے ہجرت کر کے ہندوستان تشریف لائے تھے مسلک کے اعتبار سے آپ کا تعلق سادات کے خاندان سے ہے آپ ہمدان سادات کے سربراہ سید علی ہمدان کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے پر دادا کا نام بھی سید مبارک شاہ تھا۔ جبکہ آپ کے دادا کا نام سید محمد شاہ تھا۔ آپ کے والد کا اسم گرامی سید ولایت شاہ تھا۔ آپ کا نام آپ کے پر دادا کے نام پر ہی رکھا گیا۔

آپ کے والد بزرگوار سید ولایت شاہ کا جنم کشمیر کی سرزمین پر ہوا۔ آپ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ آپ نے بھی دیگر بچوں کی طرح بچپن ہی سے حصول علم کی کوشش کی آپ کو عربی اور فارسی سے خاص قلبی لگاؤ اور گہری دلچسپی تھی اور آپ نے ان زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش بھی کی۔ اپنے والد صاحب کی وفات کے بعد آپ نے کشمیر سے ہجرت کر کے میانوالی کے قریب ایک گاؤں "ڈھلی ڈھگٹال" میں سکونت اختیار کی، غلام جیلانی شاہ جو سید مبارک شاہ کے نانا تھے انکی پیر مہر علی شاہ گولڑوی سے دوستی کا تعلق استوار تھا۔ اور صرف دوستی ہی نہیں بلکہ وہ ان سے خاص عقیدت بھی رکھتے تھے۔ ان کے والد (سید مبارک شاہ کے والد) کو اللہ تعالیٰ نے نو بچوں سے نوازا۔ جن میں چار بیٹے اور پانچ بیٹیاں شامل ہیں۔ دراصل یہ سید مبارک شاہ کے والد کے حق میں ایک بزرگ کی دعا اور پیش گوئی کا پتا دیتے ہیں۔ جن کا کہنا تھا:

"تمہاری اولاد آکاس بیل کی طرح پھیلے۔"

پیدائش:

سید مبارک شاہ کا بنیادی طور پر تعلق کشمیر سے تھا۔ لیکن ان کے والد بزرگوار نے وہاں سے ہجرت کر کے "ڈھلی ڈھگٹال" نامی گاؤں میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی چنانچہ آپ کی پیدائش بھی یہیں "ڈھلی ڈھگٹال" میں ہوئی۔ آپ اس دنیا میں یکم جنوری ۱۹۶۱ء کو تشریف لائے۔ آپ کے چار بھائی تھے اور آپ کا نمبر تیسرا تھا۔ آپ کا نام آپ کے پردادا اور "دادا" دونوں کے نام کو ملا کر "سید مبارک شاہ" رکھا گیا۔ آپ کا قلمی نام بھی "سید مبارک شاہ" ہی تھا۔ آپ اپنے نام کی بابت بات کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"میں نے اپنے والد سے کہا میرا یہ کیا نام رکھا ہے سید مبارک شاہ؟ تو انہوں نے کہا محمد

شاہ میرا باپ تھا اور مبارک شاہ ان کا باپ تھا۔ میں نے دونوں کو کمبائن کرنا چاہا اور

تجھے میں ایک دن اس کا اثر بھی دکھاؤں گا۔" (۱)

تعلیم و تربیت:

والدین کے لیے ان کے بچے ان کی عمر بھر کا سرمایہ ہوتے ہیں اور کون سے ایسے والدین ہوں گے جو اپنے اس سرمائے کو محفوظ نہیں کرنا چاہتے، لیکن ان کی صلاحیتوں کی جلا کے لیے والدین اور اساتذہ کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے سید مبارک شاہ کی صلاحیتوں کو جانچ کر ان کے نکھارنے کے مقصد کے تحت ان کے والدین نے بھی کچھ لائحہ عمل اختیار کیا اور کچھ خواب بنے۔ آپ کی والدہ چاہتی تھیں کہ آپ کو ڈاکٹر بنایا جائے تاکہ آپ دکھی انسانیت کی خدمت کا فرض سرانجام دے کر رضائے الہی حاصل کر سکیں۔ جبکہ آپ کی والدہ کی خواہش کے برعکس آپ کے والد آپ کو پاکستان آرمی میں فوجی افسر کے روپ میں دیکھنے کے خواہاں تھے۔ جبکہ خود سید مبارک شاہ کے ذہن میں ایسا کوئی مقصد کوئی ارادہ نہیں تھا بلکہ اس معاملے میں انہیں کوئی خاص پتا بھی نہیں تھا کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ آپ کی تعلیم و تربیت میں آپ کی والدہ کا کردار ناقابل فراموش ہے اگرچہ وہ خود خواندہ نہیں تھیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے صرف اپنے بچوں کو بہترین تعلیم دلوائی بلکہ ان کی تربیت اچھی طرح کر کے ایک مثال قائم کی۔ خود سید مبارک شاہ اپنی والدہ کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

"ماں گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتی تھیں اور اگر میچ دیکھنے جانا بھی ہوتا تھا تو چار دن پہلے

اجازت طلب کرنی ہوتی تھی۔ ایک بار کالج سے واپسی پر دیر ہو گئی تو والدہ صاحبہ مجھے

لینے کالج آگئیں۔" (۲)

آپ نے اپنی رسمی تعلیم کا آغاز دیگر بچوں کی طرح تقریباً چار سال کی عمر میں کیا۔ سب سے پہلے اپنے علاقے کے پرائمری اسکول میں داخلہ لیا۔ چھٹی جماعت سے انگریزی کی کتاب کا مطالعہ شروع کیا۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ قبل تک سرکاری اسکولوں میں بہت ساری بنیادی سہولتوں کا فقدان ایک عام سی بات تھی بالکل ایسے ہی آپ کے اسکول میں بھی بنیادی ضروریات میں شامل اشیاء فرنیچر ناپید تھا اور تمام طلباء زمین پر بچے ٹاٹ پر بیٹھ کر حصول علم کے عمل کی تکمیل کرتے تھے۔ آپ نے بھی اس اسکول میں زمین پر ٹاٹ پر بیٹھ کر حصول علم کے مدارج طے کیے یہ سلسلہ مڈل کلاس تک جاری رہا۔ آپ رقمطراز ہیں:

"ٹاٹوں پر بیٹھ کر پڑھا اور چھٹی جماعت سے اے بی سی شروع کی اور میٹرک سے ایم۔ اے تک سیکنڈ ڈویژن حاصل کی۔" (۳)

علمِ التعلیم میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہر بچہ ایک الگ شخصیت کا حامل فرد ہے۔ کسی ایک شخص میں کوئی ایک بات بدرجہ اتم پائی جاتی ہے جبکہ دوسرے فرد میں کوئی دوسری صلاحیت بلندیوں سے ہمکنار ہوتی ہے۔ اور ہر فرد کا اپنا الگ ہی انداز ہوتا ہے۔ اور ہر شخص کا مقیاسِ ذہانت بھی فرق ہوتا ہے۔ ایسے میں ہم کسی کو نالائق، لائق وغیرہ کا خطاب نہیں دے سکتے، عین ممکن ہے کہ کوئی فرد کسی خاص مضمون میں کمزور ہو لیکن اس کے برعکس کسی دوسرے خاص مضمون میں یدِ طولی رکھتا ہو۔ اور اس کی مہارت ہمیں اس کے رجحان کا پتا دیتی ہے۔ سید مبارک شاہ صاحب کے ساتھ بھی بچپن میں ایسا ہی معاملہ رہا۔ وہ ریاضی اور قرآن پاک میں کمزور تھے گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان مضامین کی جانب ان کا ذہنی رجحان ذرا کم تھا لیکن شاید اسی کمی کو پورا کرتے کرتے اور اس کمزوری پر قابو پانے کی کوشش میں قسمت نے پلٹا کھایا اور ان ہی مضامین میں بعد میں زیادہ صلاحیت اور قابلیت حاصل کر لی اور ان ہی مضامین سے زیادہ واسطہ رہا۔ آپ نے اپنا میٹرک سی۔ بی اسکول سے ۱۹۷۶ء میں پاس کیا۔ بعد ازاں راولپنڈی شہر کے مشہور کالج گارڈن کالج میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم کے سلسلے کو دراز کیا۔ اسی گہوارہ علم میں آپ نے چار سال گزارے اور حصولِ علم کے مدارج بطریق احسن طے کرتے رہے۔ ۱۹۷۸ء میں آپ نے ایف۔ اے کیا اور اس کے دو سال بعد یعنی ۱۹۸۰ء میں یہاں سے گریجویشن کر کے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

آپ کی علمی پیاس کا سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہو گیا بلکہ علم کے حصول کی تڑپ اور لگن آپ کو پنجاب یونیورسٹی لے گئی۔ ۱۹۸۳ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے سیاسیات کیا۔ ایم اے کے نصاب میں مختلف موضوعات پر مبنی کتب کا مطالعہ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک مقالہ بھی لکھا جس کا عنوان تھا۔

"ڈیولپمنٹ آف لوکل سیلف گورنمنٹ ان دی پنجاب (۱۹۱۸-۱۹۰۱)۔"

اس مقالے کو لکھنے میں انہوں نے تحقیقی کام میں بہترین حکمت عملی کو اپنایا اور بہت محنت سے اعداد و شمار اکٹھے کر کے انہیں بہترین انداز میں پیش کیا جس کا ثبوت ان کے حاصل کردہ نمبر ہیں انہیں ۲۰۰ میں ۱۶۰ نمبر حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

ملازمت:

ہمارے معاشرے کی ایک عام روش یا سوچ یہ ہے کہ جب کوئی فرد پڑھ لکھ جائے یا بڑا ہو جائے عمر کے حساب سے تو اسے کسب معاش کی ذمہ داریاں نبھانی چاہئیں اس غرض سے اسے کہیں نہ کہیں ملازمت یا کوئی کام یا کاروبار کرنا پڑتا ہے، اسی طرح سید مبارک شاہ نے بھی حصول تعلیم کے بعد واپڈا کے محکمے میں ملازمت اختیار کی۔ انہوں نے ملازمت کا آغاز سن ۱۹۸۴ء میں کیا اور گریڈ ۱ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس ملازمت سے سید مبارک شاہ کی متحرک اور مضطرب طبیعت کی تشفی نہ ہوئی بلکہ انہیں خوب سے خوب تر کی تلاش کشاں کشاں سی-ایس-ایس کے بام پر لے گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے یہ مشکل امتحان بھی اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ سی-ایس-ایس کے اختیاری مضامین میں سے سید مبارک شاہ نے پنجابی کا انتخاب کیا۔ اسی مضمون میں انہوں نے اپنے کمالات کا بہترین مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستان بھر میں نمایاں ترین پوزیشن لی۔ اس امتحان میں شاندار کامیابی کے نتیجے میں انہیں تربیت کے لیے سول سروس اکیڈمی لاہور جانے کا تجربہ بھی ہوا اور ۱۹۸۷ء میں یہاں سے تربیت حاصل کرے راولپنڈی میں اسسٹنٹ چیف اکاؤنٹ آفیسر، وزارت خارجہ مقرر ہوئے۔ آپ اس عہدے پر کئی سال مقرر رہے۔ اور ۱۹۸۷ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک اسی خدمات سرانجام دیں۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

- ۱۔ ڈپٹی کنٹرولر اکاؤنٹس، پی-او-ایف واہ کینٹ ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۵ء
- ۲۔ ڈپٹی ڈائریکٹر، ڈیفنس پریچیز ملٹری اکاؤنٹس، راولپنڈی، ۱۹۹۶ء
- ۳۔ ڈپٹی کنٹرولر آڈٹ ڈیفنس، راولپنڈی، ۱۹۹۷ء
- ۴۔ ڈپٹی ڈائریکٹر، واپڈا آڈٹ تربیلہ، ۱۹۹۸ء تا ۲۰۰۱ء
- ۵۔ ڈپٹی فنانشل ایڈوائزر، پاکستان ریلوے اسلام آباد ۲۰۰۱ء تا ۲۰۰۳ء
- ۶۔ ڈائریکٹر فنانس، بارانی یونیورسٹی، راولپنڈی، ۲۰۰۴ء تا ۲۰۰۷ء
- ۷۔ ڈائریکٹر ٹریننگ، ملٹری اکاؤنٹس راولپنڈی، ۲۰۰۸ء تا ۲۰۱۰ء

۸۔ جوائنٹ سیکرٹری وزارتِ دفاع، حکومتِ پاکستان ۲۰۱۱ء

۹۔ کنٹرولر ملٹری اکاؤنٹس پی۔ او۔ ایف واہ کینٹ ۲۰۱۲ تا ۲۰۱۵

شادی:

ہر انسان کی زندگی میں ایک اہم موڑ ہوتا ہے شادی کرنا۔ اس کو اہم اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے بعد انسان کی زندگی یکسر بدل جاتی ہے۔ ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں آپ کو اپنی مصروفیات میں سے اپنے گھر اور گھر والوں کے لیے زیادہ وقت وقف کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ حیثیت آپ میں موجود دیگر صلاحیتوں کے استعمال اور ان صلاحیتوں سے زندگی کو خوب تر کی طرف لے جانے کا موقع ہوتا ہے کیونکہ آپ کو اپنی انتظامی صلاحیتوں اور دیگر کئی طرح کی صلاحیتوں کی آزمائش کا موقع ملتا ہے۔

سید مبارک شاہ کی حیات کا یہ موقع ۱۹۸۵ء کو آیا آپ کی بیگم کا تعلق آپ کے قریبی رشتہ داروں سے ہے۔ وہ آپ کے خاندان کی اور قریبی رشتہ دار بھی تھیں۔ ان کی اہلیہ سیدہ نصرت شاہ ایک انتہائی خوبصورت شخصیت کی مالک خاتون ہیں۔ انہوں نے زندگی کے ہر موڑ پر آپ کا بہترین انداز میں ساتھ دیا۔ سید مبارک شاہ کے بقول ان کی زوجہ ایک با وفا بیوی اور ایک بہترین ماں ہے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بہت سلیقہ اور احتیاط سے کام لیا اور ان کی نشوونما اور پرورش و تربیت بہترین خطوط پر کی وہ سید مبارک شاہ کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"شاہ جی کا ایک شعر ان کی وفات کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے وہ میرے لیے ہی کہہ گئے ہیں وہ شعر یہ تھا:

تمہارے بعد وقت پر ہر ایک شام ہو گئی

تمہارے بعد انتظار شام کا نہیں رہا۔" (۳)

اولاد:

سید مبارک شاہ کو اللہ تعالیٰ نے اولاد کی نعمت سے نوازا اور اولاد بھی اللہ نے نیک اور صالح عطا کی۔ ان کی بیٹی فاطمہ سیدہ کے نام سے موسوم ہیں اور بڑے بیٹے سید علی حسین اور چھوٹے بیٹے کا نام آدم ہے۔ سید مبارک شاہ کی بیٹی فاطمہ سیدہ نے نسٹ راولپنڈی سے ایم۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور اب موبی لنک کے ادارے سے وابستہ ہیں اور اپنی خدمات بخوبی سرانجام دے رہی ہیں۔ سید مبارک شاہ کو اپنی دختر فاطمہ سیدہ سے

بہت پیار تھا۔ ان کی بیٹی لکھنے پڑھنے کے جملہ کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں گویا ان کا دستِ راست تھیں۔ انہیں اپنے والد کی شاعری سے خاص قلبی لگاؤ اور انس تھا۔ ان کو یہ شعر بطور خاص اچھا لگتا ہے:

"یہ ہر دن تھوڑا تھوڑا کر کے مرنے کا تکلف کیا

یہ کام اک روز بہتر ہے کہ سارا کر لیا جائے۔" (۵)

آپ کے بڑے بیٹے سید علی حسین ہیں انہوں نے راولپنڈی کے ڈویژنل پبلک سکول سے میٹرک پاس کیا اور انڈس کالج راولپنڈی سے ایف۔ ایس۔ سی کے امتحان کو پاس کیا بعد ازاں پنجاب کالج راولپنڈی سے بی کام کیا اور اس کے بعد اقراء یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم۔ بی۔ اے کیا۔

سید مبارک شاہ کے کلام میں متعدد جگہوں پر اور مختلف مقامات پر ان کے بیٹے علی حسین کا ذکر ہمیں ملتا ہے۔ ان کے کلام میں جہاں جہاں انہوں نے اولاد کے حوالے سے کچھ کہا ہے۔ اس میں ان کی والدہانہ محبت اور ہمدردانہ شفقت ٹپکی پڑتی ہے اور ان کے جذبات اور احساسات بخوبی قارئین پر عیاں ہوتے ہیں اور کیوں نہ ہوں اولاد ایک ایسی نعمت اور دولت ہے کی یہ انسان کو سرشار کر دیتی ہے خوشیوں سکون سے اور دل مسرور اور شادماں ہو جاتا ہے۔ ایک نظم بعنوان "تشکر" میں سید مبارک شاہ اپنے بیٹے کیلئے کیسے محبت کا اظہار کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

"ہیلو میں ٹھیک ہوں لیکن

علی کا کچھ بخارا اتر!

علی تو ٹھیک ہے بالکل یہ میرے سامنے بیٹھا کھلونوں سے ---

کرم ہے میرے مالک کا

خدا کی مہربانی ہے۔" (۶)

تیسرے نمبر پر سید مبارک شاہ کی اولاد آدم ہیں۔ یہ ان کی سب سے چھوٹی اولاد ہے انہوں نے حصولِ تعلیم کے مختلف مدارج اس انداز سے طے کیے کہ پہلے اولیول کیا اور پھر اے لیول کیا۔ مبارک شاہ کا اپنے اس صاحب زادے کے حوالے سے یہ کہنا تھا کہ یہ تمام بہن بھائیوں میں سے سب زیادہ ذہین اور قابل ہیں۔

ادبی زندگی کا آغاز:

ادبی زندگی کے آغاز کے حوالے سے سید مبارک شاہ کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بچپن سے ہی وہ ادب کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا محض دوسری جماعت میں ہی تھے کہ پہلی بار نعتیہ اشعار کہنے شروع کیے۔ انہوں نے پہلی بار جو شعر لکھا تھا:

یا رب محمد ﷺ ہیں میرے نبی ﷺ
میں غم نہ کروں گا کبھی^(۷)

سید مبارک شاہ کو شاعری اور شعر گفتن ورثے میں ملے ان کے والد محترم سید ولایت شاہ کو بھی شاعری میں خاصی دلچسپی تھی اور بہترین شعری ذوق کے حامل تھے۔ ان کا خاص الخاص مطالعہ فارسی، ادب، قرآن اور تعلیمات قرآن اور اقبالیات کے حوالے سے تھا۔ سید مبارک شاہ نے بھی اپنے والد کے ذوق اور دلچسپی اور رجحان سے خاص اثر لیا۔ آپ نے شاعری کا باقاعدہ آغاز بہت کم عمری میں ہی کیا۔ جب آپ میٹرک کے طالب علم تھے تب آپ نے "محبت" کے عنوان سے ایک نظم لکھی:

محبت وہ توکل ہے، تدبر جس پر شرمندہ
محبت میرا فن بھی ہے محبت میرا پیشہ ہے
میں کوہِ غم پہ تنہا ہوں محبت میرا تیشہ ہے

گویا یہ آپ کی باقاعدہ ادبی سرگرمیوں کا آغاز یا نقطہ اول تھا اس کے بعد تو گویا تخلیق کا ایک ناتمام سلسلہ ہی چل نکلا اور آپ نے بہت زیادہ شاعری کرنی شروع کی ۱۹۷۶ء میں پہلی بار آپ کی غزل روزنامہ "نوائے وقت" میں شائع ہوئی۔ اس نظم کا شعر ملاحظہ ہو:

محفل اہل جہاں میں کیا کوئی جانے مجھے
دل کسی کے پاس ہو تو آ کے پہچانے مجھے^(۸)

مبارک شاہ کی ہمیشہ محترمہ نجمہ سیدان کی شاعری اور ادبی تخلیقات کے آغاز کے بارے میں بیان کرتی ہیں کہ وہ جو بھی لکھتے سب سے پہلے آپا (ہمشیرہ) کو آکر سناتے وہ رقمطراز ہیں:

"ہمارے پاس تفریح کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا تھا شاید اس لیے بھی ہم بہن بھائیوں کا رشتہ بہت مضبوط تھا۔ ایک شعر اس کی کتابوں میں نہیں مگر جب میں اس کو یہ شعر سناتی تو وہ اپنی پوری غزل بول دیتا تھا۔"^(۹)

کوئی ایسا ہم زباں دے، جسے گلے لگا کے روئیں
سینے میں جس کے دل ہو، دل غم سے آشنا ہو

بہن رقمطراز ہیں:

"مبارک شاہ کی شاعری میں میرے پسندیدہ شعروں میں ایک یہ شعر بھی شامل ہے۔"

زہر خوں سے بھر دیا اور رشکِ مجنوں کر دیا

دوست کیا کیا دے گئے چاہت کے نذرانے مجھ^(۱۰)

حوصلہ افزائی ایک ایسی توانائی ہوتی ہے کہ وہ مہمیز کا کام کرتی ہے اور اس کے برعکس حوصلہ شکنی زہر کی طرح ہوتی ہے اگر کسی کی حوصلہ افزائی کی جائے کسی بھی معاملے میں تو وہ اس میں مزید بہتری کے لیے کوشاں ہو جاتا ہے بالکل ایسے ہی سید مبارک شاہ کے اساتذہ نے بھی شاعری کے حوالے سے ان کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی کی کالج کے اساتذہ نے قدم قدم پر انہیں داد و تحسین سے نوازا جس سے ان کی ہمت بڑھ گئی اور انہوں نے پہلے سے زیادہ اچھی تخلیقات کے لیے کوشش کی۔ یونیورسٹی کی سطح پر پہنچ کر آپ کی تخلیقات میں زیادہ نکھار اور بہتری آگئی۔ اس درجے پر پہنچنے کے بعد آپ کی انقلابی شاعری کو زیادہ پذیرائی نصیب ہوئی۔ طالب علمی کے زمانے سے لے کر سول سروس اکیڈمی تک مبارک شاہ کی شاعری کو پختگی، حوصلہ مندی اور ایک نئی جہت ملی۔ جس طرح کسی بھی فن میں مہارت حاصل کرنے اور سیکھنے کے لیے باقاعدہ تربیت درکار ہوتی ہے۔ اور مذکورہ فن کی کچھ باریکیاں اور تکنیک ہوتی ہے اور ان کے بارے جاننا اور سیکھنا از حد ضروری ہوتا ہے نعتیہ شاعری بھی ایک تخلیقی کام ہے گو کہ یہ صلاحیت خداداد ہوتی ہے لیکن سیکھنے اور تربیت حاصل کرنے اور مشق کرنے سے اس میں بہتری اور نکھار آ جاتا ہے اسی غرض سے آپ میں کیوں کہ یہ صلاحیت قدرت نے ودیعت کر رکھی تھی لیکن اس کو مزید جلا دینے اور نکھارنے کے لیے اور کاملیت کے درجے تک رسائی کے لیے آپ نے کینٹ میں موجود رؤف امیر مرحوم کی شاگردی اختیار کی اور ان سے چند تکنیکی چیزیں سیکھیں۔ ۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۰ء تک وہ اپنی تخلیقات اور شاعری کو "فنون" میں اشاعت کے لیے ارسال کرتے تھے۔ اسی دوران احمد ندیم قاسمی بعض اوقات آپ کو کلام کے سلسلے میں مشورہ دیتے۔

دوران ملازمت آپ نے جو شاعری کی اس سلسلے میں آپ کے دوست جناب انجم الثاقب بٹ نے آپ کی اصلاح کی اس سلسلے میں بحر، وزن، قافیہ اور ردیف کے سلسلے میں آپ ان سے مشاورت کر لیتے تھے۔

۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۵ء تک آپ بسلسلہ ملازمت واہ میں رہے۔ یہاں آپ کئی ادبی تنظیموں کے سرگرم رکن رہے۔ آپ کے چند رفقاء نے "صریر خامہ" کے نام سے ایک ادبی تنظیم قائم کی۔ اس تنظیم میں رؤف امیر (مرحوم)، ڈاکٹر وحید احمد، مشتاق عاصم، عصمت حنیف، شائد مجید رانا اور حسن ناصر وغیرہ شامل تھے۔ "صریر خامہ" ادبی تنظیم کا باقاعدہ ہر ہفتے بروز منگل اجلاس ہوتا تھا اور اس اجلاس میں واہ کینٹ، راولپنڈی، ٹیکسلا اور حسن ابدال سے لوگ شریک ہوتے۔ اس طرح مبارک شاہ کو دوستوں اور احباب کا ایک وسیع حلقہ میسر آیا۔ سید مبارک شاہ کی طبیعت مشاعروں میں شرکت سے زیادہ مطمئن نہ ہوتی تھی اسی لیے کم ہی مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے۔ بقول مبارک شاہ:

"مشاعرے میں بات ایک مصرعے میں پوری نہیں ہوتی اور سامعین واہ واہ کر اٹھتے ہیں۔" (۱۱)

تو بھی سخن شناس تھا درد آشنانہ تھا
تو نے بھی شعر سن کے میرے واہ واہ کی

سید مبارک شاہ اپنا کلام مختلف رسالوں، ماہناموں اور اخبارات میں گاہے گاہے چھپواتے رہے اس سلسلے میں "فنون"، "ادبیات"، "اوراق"، "ماہ نو"، "اجراء" اور "حرف" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ابتداء میں جیسے ذکر کیا گیا کہ انہیں فارسی زبان و ادب اور قرآن اور مضامین قرآن سے خاص قلبی لگاؤ تھا یہی بات بعد میں ان کے کلام میں واضح طور پر نظر آتی ہے خود انہوں نے بھی اپنے کلام اور شاعری کی بنیاد قرآن کو قرار دیا اور اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ کیوں کہ انہوں قرآن کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ کیا اسی لیے اس کا اثر ان کی شاعری میں جھلکتا ہے۔ قرآن کے علاوہ پنجاب کے صوفی شعراء کے کلام سے بہت متاثر تھے۔ آپ کو میاں محمد بخش، بلھے شاہ، شاہ حسین، خواجہ غلام فرید، بابا فرید گنج شکر، وارث شاہ جیسے نامور صوفی شعراء کے کلام اور شاعری سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ رقمطراز ہیں:

"میری شاعری کے ذرائع میں قرآن، اقبالیات غالب کسی حد تک گوتم بدھ، سکران اور پھر تصوف اس کے بعد پنجابی بابے۔ کیوں کہ ان باباؤں کے ہاں "میں، میں" نہیں۔" (۱۲)

سید مبارک شاہ اپنے پسندیدہ شاعر کے حوالے سے اپنی کتاب "جنگل گمان کے" کے دیباچے میں کچھ حقائق بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"میرے لیے اس بات کا فیصلہ محال ہے کہ کس شاعر سے کس حد تک متاثر ہوا ہوں۔ مجھے شکیب کی تڑپ، عدم کی مستی، ساغر کی قلندری، اقبال ساجد کی کاٹ، ناصر کاظمی کی اداسی، فراز کے تغزل، اور اظہار الحق کے استغنا سبھی نے متاثر کیا۔ مجھے اچھی شاعری ہمیشہ اچھی لگتی ہے۔ اس لیے میں جہاں مجید امجد اور اختر حسین جعفری کی نظموں کے سحر کا شکار ہوں وہاں وحید احمد کی نظم میں بھی گرفتار ہوں اسی طرح غالب اور فیض کی غزلوں سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ میری اپنی غزل بھی میرے لیے معیار ہے۔" (۱۳)

سید مبارک شاہ نے اپنی شاعری کی بنیاد قرآن کو قرار دیا اور ساتھ ہی ساتھ اقبال کو بھی اپنی شاعری کا محرک قرار دیتے ہیں، وہ رقمطراز ہیں:

"قرآن، بابے اور اقبال میری شاعری کا سورس ہیں۔" (۱۴)

ایک جگہ اور وہ کچھ یوں رقمطراز ہیں:

"میں نے اپنی اس فہرست میں اقبال کا کہیں حوالہ نہیں دیا۔ جو بہت زیادہ قریب ہو بعض اوقات آنکھ کے احاطے میں نہیں آتا۔ یہی معاملہ میرا اقبال کے ساتھ ہے۔" (۱۵)

سید مبارک شاہ خود ایک شاعر تھے اور بہت سے دوسرے شعراء کا کلام آپ کے مطالعے میں بھی رہتا تھا مگر آپ نثر کے بھی بہترین قاری تھے۔ اور بہت شوق سے منٹو اور پریم چند کو اور ان کے افسانوں کو پڑھتے تھے اور دوسری جانب کرنل محمد خان اور مشتاق احمد یوسفی کی تخلیقات بھی آپ کے مطالعے میں ہوتی تھیں۔

آپ خود شاعری کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"شاعری کو لکھنے کی بجائے اس کا استعمال زندگی میں کرتا ہوں شاعری سنانے کی نہیں پڑھنے کی اور اس سے کہیں زیادہ برتنے کی چیز ہے۔" (۱۶)

شاعری کے بارے میں ان کے ذہن میں کیا عقائد تھے اس کے بارے میں وہ رقمطراز ہیں:

"زندگی کا بہت سا علاقہ ابھی دریافت ہونا باقی ہے ماضی، حال، مستقبل سے ماوراء
 جہانوں کی طرح ایک تیسرا جہاں بھی کہیں ہو گا آٹھواں رنگ آنکھ کی گرفت میں نہ
 سہی موجود تو ہے، ساتویں جہت نامعلوم ہے مگر مفقود نہیں۔ چھٹی حس کی طرح کوئی
 پانچواں موسم بھی تو ضرور ہو گا۔ بہت ساری آوازیں ہیں جن کے مخرج ہمارے پاس
 نہیں، ان نامعلوم موجودات کا انکار اپنی غلط فہمی کا اقرار ہے۔" (۱۷)
 ان کی نظم "گنتی" بھی اس کی خوبصورت مثال ہے۔

گنتی:

یہ آٹھ پہروں شمار کرنا
 کہ سات رنگوں کے اس نگر میں
 جہات چھ ہیں
 حواس خمسہ
 چہار موسم
 زماں ثلاثہ
 جہان دو ہیں
 خدائے واحد!

یہ تیری بے انت وسعتوں پر نکلے ہوئے مسافر
 عجیب گنتی میں کھو گئے ہیں۔" (۱۸)

سید مبارک شاہ کی تصانیف کا سرسری جائزہ
 ۱۔ جنگل گمان کے:

سید مبارک شاہ کا پہلا مجموعہ "جنگل گمان کے" اس مجموعے کی اشاعت کے پس پشت آپ کے ایک
 قریبی دوست محمود اسلم لہ کی مساعی ہیں۔ یہ مجموعہ ان کے بے حد اصرار پر آپ نے شائع کروایا۔ محمود اسلم
 اللہ "جنگل گمان کے" کے دیباچے میں رقمطراز ہیں:

"مبارک شاہ کی شاعری سے میری ابتدائی شناسائی ان دنوں کی ہے جب ہم دونوں
 پنجاب یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے اور شعبہ جات مختلف ہونے کے باوجود نیوکیمپس

ہاسٹل کی زندگی ہمیں ایک دوسرے سے بے تکلفی کے مواقع فراہم کر رہی تھی مگر سچ یہ ہے کہ ان دنوں زیادہ تر دوست غیر سنجیدہ شاعری سن کر زیادہ محظوظ ہوتے تھے۔ تاہم کچھ تقاریب اور یونیورسٹی کے مشاعروں میں اس کا جداگانہ لب و لہجہ سب کو چونکا دینے کے لیے اس وقت بھی کافی تھا۔ یہ ۱۹۸۶ء کی بات ہے۔ شاہ سول سروس جوائن کر چکا تھا اور میں سی ایس ایس کے امتحان کے لیے راولپنڈی میں اس کے گھر مقیم تھا۔ انہی دنوں دیگر کتابوں میں الجھی اس کی بیاض ہاتھ لگی اور جیسے ایک ایک شعر دل میں اترتا چلا گیا۔ اس روز سے آئندہ آنے والے چھ برس مجھے شاعر کو یہ اصرار کرتے ہوئے گزر گئے کہ ان اشعار کا نہ چھینا اور دو شاعری کے ساتھ نا انصافی ہوگی۔ ۱۹۹۲ء میں محترم خالد شریف نے مسودہ دیکھ کر کہا کہ یہ بہت پہلے چھپ جانا چاہیے تھا اور یوں "جنگل گمان کے" منظر عام پر آئی۔^(۱۹)

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ماوراء پبلشرز کے زیر اہتمام ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ جبکہ دوسرا ۲۰۱۰ء بک ہوم لاہور سے اور تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۴ء میں بک ہوم لاہور ہی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس مجموعے میں مبارک شاہ کی تخلیقات میں سے نظمیں اور غزلیات کو لیا گیا ہے۔ غزلوں کی تعداد قریباً ۵۵ جبکہ نظمیں ۵۱ کی تعداد میں لی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد متفرقات بھی شامل مجموعہ ہیں۔ یہ کتاب تقریباً ۷۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب کا انتساب "منصور حلاج" کے نام ہے اور اس کے ساتھ یہ شعر رقم ہے۔

آدم کی کسی روپ میں تحقیر نہ کرنا

پھرتا ہے زمانے میں خدا بھیس بدل کر

۲۔ ہم اپنی ذات کے کافر:

"ہم اپنی ذات کے کافر" سید مبارک شاہ کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ اس کتاب ایڈیشن ۱۹۹۵ء اولین سنگ میل پہلی کیشنز لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس کے بعد اس کی اشاعت دوم اور اشاعت سوم بک ہوم لاہور کے تحت بالترتیب ۲۰۱۰ء، ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ نظموں اور غزلوں کو ملا کر مرتب کیا گیا ہے اس میں موجود نظموں کی تعداد ۵۴ جبکہ غزلیں تعداد میں ۴۸ ہیں۔ اس کے علاوہ متفرق اشعار بھی شامل کئے گئے ہیں۔ اس کے صفحات ۲۱۰ ہیں۔

کتاب کا انتساب مخاطب کے نام اس قرآنی آیت سے لیا گیا ہے۔

یا ایھا الانسان ما غرک لربک الکرم

اور اس کے آغاز میں یہ شعر بھی نظر آتا ہے۔

لوگ انبار طلب لے کے کھڑے تھے لیکن

ہم سے اک تیری تمنا بھی سنبھالی نہ گئی

اس کتاب کا آغاز "دریافت" کے عنوان سے مبارک شاہ کے تحریر کردہ مضمون سے ہوتا ہے۔

سید مبارک شاہ اپنی کتاب کے بارے میں خود رقمطراز ہیں:

"اگر کوئی مجھے یہ کہے کہ اپنی کسی ایک کتاب کا نام لو، تو میں "ہم اپنی ذات کے کافر" کا

نام لوں گا۔ یہ میری بہترین تصنیف ہے۔" (۲۰)

۳۔ مدارِ نارسائی میں:

یہ سید مبارک شاہ کا آخری اور سوم مجموعہ کلام ہے یہ ۱۹۹۸ء میں الرزاق پبلی کیشنز لاہور کے زیر

اہتمام شائع ہوا۔ اس کے بعد اس کی اشاعت دوم اور سوم بالترتیب ۲۰۱۰ء اور ۲۰۱۴ء میں بک ہوم لاہور سے

ہوئی اس میں بھی حسب سابق نظموں اور غزلوں کو منتخب کیا گیا ہے۔ اس میں ۵۳ نظمیں اور غزلیں شامل کی

گئی ہیں۔ اس کے صفحات کی ۲۰۴ ہے۔ اس کتاب کا انتساب سید مبارک شاہ نے اپنی عزیز از جان والدہ کے نام

کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ شعر درج ہے:

تمہارے بعد وقت پر ہر ایک شام ہو گئی

تمہارے بعد انتظار شام کا نہیں رہا

اس کتاب کا آغاز "مدارِ نارسائی میں" کے عنوان سے سید مبارک شاہ کے تحریر کردہ ایک مضمون

سے ہوتا ہے اس کتاب کے اشاعت دوم میں اشاعت اول کی نسبت کچھ ترامیم یا اضافے کیے گئے تھے۔

دوسری اشاعت میں ۳۹ غزلیات اور ۵۹ نظمیں شامل تھیں۔ اس کے برعکس اشاعت اول میں کل تخلیقات کی

تعداد ۸۶ تھی۔ جبکہ اشاعت دوم یہ تعداد بڑھ کر ۹۸ ہو گئی۔ ایک ہی کتاب میں آنے والا یہ حیران کن

تغیر دراصل سید مبارک شاہ کی غور و حوض کی عادت اور اپنی ہی تخلیقات میں تفکر کرنے اور اس کی اصلاح یا

اسکی نکھار کی عادت کا غماز ہے۔

۴۔ برگد کی دھوپ میں:

برگد کی دھوپ میں سید مبارک شاہ کی نثری تخلیق ہے دراصل یہ منیلا اور تھائی لینڈ کا سفر نامہ ہے جو اول اول گوجرہ کے سہ ماہی رسالے "نزل" میں قسط وار چھپتا رہا۔ یہ رسالہ سید اذلان شاہ کے زیر پرستی شائع ہوتا تھا۔ "نزل" میں چھپنے کے بعد ۲۰۰۰ء میں سروش پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع ہوا۔

اس سفر نامے کا انتساب "گوتم بدھ کی بیوی" بشودھرا کے نام ہے منیلا اور تھائی لینڈ میں گوتم بدھ کے بہت آثار پائے جاتے ہیں اور اس سفر نامے میں ان کا ذکر بھی کافی مؤثر انداز میں نظر آتا ہے۔

نثر میں ان کتابوں کے علاوہ اور بھی کئی ایسی کتابیں ہیں جن کے دیباچے سید مبارک شاہ نے تحریر کیے ان کتب میں اعظم توقیر کی کتاب "چھوٹی سی غلط فہمی" شہزادراؤ کی کتاب "میں کسی اور سلسلے میں ہوں" رفعت سروش فیصل کی کتاب "نوائے سروش" قابل ذکر ہیں۔

سید مبارک شاہ کے کلام پر مبنی کتب کی اشاعت کا تمام تر سہرا ان کے دوست محمود اسلم اللہ کے سر بند ہوتا ہے سید مبارک شاہ کی شاعری کے بارے میں وہ کچھ یوں رقمطراز ہیں:

"میرے لیے یہ طے کرنا آج بھی ممکن نہیں ہے کہ مجھے مبارک شاہ سے اپنا تعلق زیادہ عزیز ہے یا اس کی شاعری سے۔ اگرچہ دونوں ایک دوسرے کی ضد نہیں تاہم بسا اوقات مجھے انتخاب مشکل میں ڈال دیتا ہے شاعر خود بھی کئی مقامات پر اس کشمکش کا شکار دکھائی دیتا ہے۔" (۲۱)

انتخاب مشکل ہے پھر بھی چھوڑ کر تجھ کو

جا تیری محبت کو اختیار کرتے ہیں

وصال:

انسان اس کائنات میں اشرف المخلوقات ہے مگر ہے بے ثبات اور ثبات اور بقا اور دوام صرف اور صرف اللہ باری تعالیٰ کو ہی زیبا ہے۔ باقی ہر ذی روح کو دنیا سے جانا ہے۔ اور اسی قانون کے مطابق آج تک جتنے بھی ولی پیغمبر اور نیک و بد لوگ گزرے ہیں سب کا انجام یہاں سے مراجعت ہی ٹھہرا۔ موت قانونِ فطرت ہے۔ اور کسی کو اس سے مفر بھی امیر ہو یا غریب ادنیٰ و اعلیٰ، سب کو ایک نہ ایک دن اس کا مزا چکھنا ہے۔ ارشادِ بانی ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾

سید مبارک شاہ بہت کم عمر میں ہی جوڑوں کے درد کے عارضے میں مبتلا تھے اور علیل رہے اور اس کے علاوہ ہائی بلڈ پریشر کے مرض میں مبتلا تھے۔ ۲۶ جون ۲۰۱۵ء کی رات اُن پر بہت بھاری گزری تمام رات تکلیف شدید میں مبتلا رہے۔ ۲۷ جون کی صبح ان کے اہل خانہ انہیں سی۔ ایم۔ ایچ راولپنڈی لے گئے۔

تشخیص کے بعد معالجین نے بتایا کہ سید مبارک شاہ نمونیہ کے عارضے کے علاوہ شدید ہارٹ اٹیک کا بھی شکار ہوئے ہیں اس بارے میں جان کر ان کے اہل خانہ بہت زیادہ پریشان بھی ہوئے۔ اسی ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں وہ صبح ۲۷ جون ۲۰۱۵ء کو تقریباً دن ۲۰:۱۰ پر وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ہر دن تھوڑا تھوڑا کر کے مرنے کا تکلف کیا
یہ کام اک روز بہتر ہے کہ سارا کر لیا جائے

اظہارِ تعزیت:

سید مبارک شاہ بہت جلد محض اور محض ۵۴ سال کی عمر میں اس جہان فانی سے کوچ کر کے اپنے پیاروں کو داغ مفارقت دے گئے ان کے جنازے میں شہر کے اور دیگر شہروں کے بے شمار لوگوں نے شرکت کی جن میں ادب سے تعلق رکھنے والے اور دیگر شعبہ ہائے زندگی کے افراد سب شامل تھے۔ اور یہ بات عوام الناس میں ان کی مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

"عوام الناس کا کہنا ہے کہ سینکڑوں افراد کا سمندر رواں دواں تھا۔ اور یہ جنازہ

راولپنڈی اور اسلام آباد کے بڑے جنازوں میں سے تھا۔" (۲۲)

"لاہور پاک ٹی ہاؤس" میں سید مبارک شاہ (مرحوم) کی یاد میں ۵ دسمبر ۲۰۱۵ء کو یادداشتی محفل کا اہتمام کیا گیا جہاں سید مبارک شاہ کے عزیز دوست محمود اسلم اللہ سمیت دیگر علمی و ادبی اور نامور شخصیات نے شرکت کی۔ اس محفل کے شرکاء نے سید مبارک شاہ کی بے وقت موت پر اظہارِ افسوس کیا اور ان کی موت کو اردو ادب اور اردو شاعری کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیتے ہوئے ان کے خلا کو پر کرنے کے سلسلے میں کہا کہ یہ ناقابلِ عمل بات ہے۔ اس محفل میں آپ کے قریبی دوست محمود اسلم اللہ نے اپنی محبت اور عقیدت کو کچھ اس انداز میں رقم کیا:

"میں تو یہ فیصلہ بھی نہ کر سکوں کہ مجھے مبارک شاہ زیادہ عزیز ہے یا اس کی شاعری لیکن

یہ تب کی بات ہے۔ لیکن آج آپ کے سامنے مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی دشواری

محسوس نہیں ہو رہی کہ مجھے مبارک شاہ اس کی شاعری سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کی

شاعری سینکڑوں دلوں میں بستی ہے۔ اس کی شاعری بہت لوگوں کو عزیز ہے مگر وہ

عزیز از جاں تعلق تھا۔ اسے کیا نام دوں؟ اسے کیسے بھول جاؤں؟۔" (۲۳)

محمود اسلم اللہ نے اپنی گفتگو کے دوران ایک اور حیرت انگیز حقیقت کے بارے میں بتایا کہ ان کی شاعری کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے اور اس کی روح کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے قبل از موت ہی اپنی شاعری میں اپنی موت کے حوالے سے پیش گوئی کے طور پر کچھ باتیں بیان کر دی تھیں۔ ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ یوں رقمطراز ہیں:

"مبارک شاہ کی شاعری سے یہ بات واضح ہوتی ہے اسے اپنی عمر کے مختصر ہونے کا جیسے

یقین ہو وہ جانتا تھا کہ اسے کرائے کا یہ مکان بہت جلد خالی کرنا ہے۔" (۲۴)

بدن میں میری جان کب تک رہے گا
کرائے کا مکان کب تک رہے گا

اتنے میں امتحان کی مہلت گزر گئی
سمجھے نہ تھے سوال کا پورا متن ابھی

امجد اسلام امجد سید مبارک شاہ کی وفات کے بعد اپنے کالم میں کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

"ایسے بانکے، تیکھے خیال افروز، فکر انگیز اور غیر معمولی جرات اظہار کے حامل اشعار کہہ سکنے والا مبارک شاہ اب ایک ایسے دربار میں پہنچ گیا ہے جس کا مالک خود اپنے بندوں کو بار بار غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ سو مجھے یقین ہے کہ وہاں اس کا استقبال ایک پسندیدہ مہمان کے طور پر ہو گا البتہ جو بات اس نے وہاں پہنچ کر کرنی ہے اسے ایک شعر کی شکل میں وہ کچھ اس طرح سے کہہ سکتے ہیں۔" (۲۵)

قیامت میں ذرا سا تخلیہ بھی
کہ تم سے بھی ہمیں کچھ پوچھنا ہے

سید مبارک شاہ کی بڑی بہن ان کی وفات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"ہم زندہ لوگوں کی قدر نہیں کرتے مبارک شاہ ہمارے پاس پورا انسٹیٹیوٹ تھا ایک

یونیورسٹی تھا۔" (۲۶)

سید مبارک شاہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے ہیں اور اب ہم ان کی ذات سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی شفقت سے بھی محروم ہو چکے ہیں مگر آنے والے دور میں ان کا کلام لوگوں کے دلوں میں انہیں زندہ رکھے گا۔ ان کی شاعری انہیں حیاتِ ابدی دلانے کا ایک ذریعہ بنے گی اس ضمن میں محمود اسلم اللہ رقمطراز ہیں:

"مبارک شاہ نے جتنی معیاری، اچھوتی اور سحر انگیز شاعری کی ہے مجھے اس کی تخلیق کے زندہ رہنے کے بارے میں کوئی وہم نہیں، مگر وہ شخص وہ باتیں، وہ اختلاف، وہ محبت، وہ صحبتیں، وہ رفاقتیں اب کہاں؟ شاہ میں ان محبتوں کا قرض نہیں چکا پاؤں گا۔" (۲۷)

خدائے بزرگ و برتر سے التماس و دعا ہے کہ وہ انہیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کا جہان ابدی گل و گلزار کر دے اور انہیں جنت الفردوس کا مکین بنائے، اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین)۔

ج۔ بنیادی مباحث

i. تصوف

لفظ "تصوف" کے معنی کے حوالے سے ماہرینِ لسانیات میں ہمیشہ اختلاف کی فضا نظر آتی رہی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ میرے خیال میں یہ رہی ہے کہ قرآن و حدیث میں اس لفظ یا اس اصطلاح کا وجود کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ یہ ہے کہ عربی قدیم لغات میں بھی یہ لفظ نظر نہیں آتا اسی وجہ سے ہر دور کے محققین اور علماء اس بارے میں مختلف آراء دیتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت سید ابوالحسن علی بن عثمان الجلابی الحجویری شمر لاہوری معروف بہ گنج بخش رحمہ اللہ (۴۰۰-۲۴۶) بمطابق (۱۰۰۹ء سے ۱۰۷۲ء) فرماتے ہیں:

مردمان اندر تحقیق اس اسم بسیار سخن گفته اند و کتب ساخته

ترجمہ: لوگوں نے اس اسم کی تحقیق کے بارے میں بہت گفتگو کی ہے اور کتابیں لکھی ہیں۔

ایک جگہ ذکر ہے کہ عہدِ جاہلیت میں "صوفہ" نام کی ایک قوم تھی اور جو اللہ کی بہت فرمانبردار تھی اور اللہ کی یاد اور ذکر میں یکسو ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ قوم خانہ خدا کی خدمت میں اپنا وقت گزارتی تھی اور شرک

اور بت پرستی سے خود کو دور رکھے ہوئے تھی اس قوم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خانہ کعبہ کے مجاور تھے اور حاجیوں کے آرام و آسائش کے لیے انتظامات کرتے تھے۔ اس قوم کا پہلا شخص "غوث بن مر" تھا۔

حضرت سید ابوالحسن علی بن عثمان الجلابی البجوری ثمر لاہوری معروف بہ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ "کشف المحجوب" میں فرماتے ہیں کہ ہر ایک کے نزدیک تصوف کے معانی کی تحقیق میں بہت سے لطائف ہیں۔ مگر اس لفظ تصوف کے مفہوم کے قریب قریب کوئی بھی نہیں اس لیے اب لفظ صفا ہی زیادہ قابلِ تعریف ہے۔ اور اس کی ضد "کدورت" ہے۔ آپ کا ارشاد ہے۔ دنیا کی صفائی جاتی رہی اور اس کی کدورت باقی رہ گئی۔ کسی بھی چیز کی لطافت، خوبی اور پاکیزگی کا نام صفائی اور پاکی ہے، اور اس کے برعکس کسی چیز کی ناپاکی اور کثافت اور میلاپن اس کا تکرر ہے۔ پس جب اہل تعریف نے اپنے اخلاق اور معاملات کو صاف کر لیا اور مہذب کر لیا اور اپنی طبیعت کو آفات و رزائل بشری سے بچا لیا اس لیے انہیں صوفی کہا گیا۔

علامہ شبلی نعمانیؒ کے خیال میں تصوف کا لفظ "سین" سے تھا۔ جس کا مادہ "سوف" یعنی حکمت تھا۔ دوسری صدی میں جب مختلف یونانی کتب کے تراجم ہوئے تو یہ لفظ عربی میں داخل ہو گیا اور اس کے بعد "ص" سے لکھا جانے لگا۔

بیشتر علماء جن میں شیخ ابو بکر کلابازیرؒ، امام ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن خلدون شامل ہیں تصوف کے بارے میں کہتے ہیں کہ تصوف "صوف" سے بنا ہے جس کے معنی "اون سے بنا" کے ہیں اس نظریے کے قائلین کا خیال ہے کہ چونکہ اونی لباس انبیائے کرام اور اولیائے عظامؑ کا پہناوا اور شعار رہا ہے اور صوف کو ہمیشہ ترک دنیا کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے اس لیے اہل تصوف نے اونی لباس کو ملبوس کے لیے پسند کیا اور اسے اختیار کیا اور اسی وجہ سے اس گروہ کو "صوفیہ" کے نام سے معروفیت حاصل ہوئی ان کے نزدیک سنت نبوی سے ماخوذ ہے چنانچہ مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے کہ:

فغسل وجهه و یدیه و علیہ جبہ من صوف

ترجمہ: پھر آپ ﷺ نے اپنے چہرہ اقدس اور دونوں ہاتھوں کو دھویا اس وقت آپ

نے اونی جبہ زیب تن فرمایا ہوا تھا۔

اس مندرجہ بالا بحث سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تصوف کی تعریف میں اگرچہ بہت اختلاف پائے جاتے رہے ہیں۔ لیکن اہل تصوف و باطنیت کے حالات سے اتنی بات یقین کے ساتھ ذہن میں

گھر کر جاتی ہے کہ تصوف اور باطنیت میں ذوق و وجدان و آگہی، الفت و شیفگی بنیادی و مرکزی حیثیت کی حامل ہیں۔

جناب من! اس دینا میں ایسی اقوام آباد رہی ہیں جو اپنی زبان، تمدن و تہذیب کے اعتبار سے محض تھوڑا یا سطحی اختلاف نہیں بلکہ بُعد المشرقین یا بہت زیادہ اختلاف کی حامل رہی ہیں۔ لیکن اختلاف کے ساتھ ساتھ ایسا رنگ اختلاف بھی ملتا رہا ہے جو عالم انسانیت کی سرشت میں رچا بسا ہے۔ اس زمین کے مکینوں میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں جو دل جیسی نعمت سے عاری ہو یہ نگار خانہ اپنی گونا گوں رعنائیوں اور تابانیوں کے ساتھ محو و مستِ دلربائی ہے۔ نورِ سحر، رنگِ شفق، سلکِ کہکشاں ہنگامہ روزِ سکوتِ شبِ نفہ و آبخار، فرازِ کوہسار یہ تمام کے تمام اپنی اپنی جگہ دعوتِ کیف و نظر دے رہے ہیں۔ لیکن اس صنایع وہ پسندیدہ ترین مخلوقِ احسن تقویم کہلائی خود اپنی بنائی ہوئی چیز کے لیے سب سے زیادہ دلفریب اور موزوں بنی ہوئی ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بھی کافی ہے جو جو شیفۃ "لب لعل" و "خطِ نگاری" بنا کر محبت کی تقریر کے سزاوار ٹھہرے ہیں اور اس محبت بین الناس کے علاوہ مخلوقات کا اپنے رب اور خالق سے بھی تعلق استوار ہو چکا ہے جو کبھی کبھی عبودیت اور معرفت کی حدود سے آگے بڑھ کر محبت والہانہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ تعلق اور رشتہ دو طرح سے استوار ہوتا ہے کبھی تو یہ بالواسطہ قائم ہو جاتا ہے اور کبھی یہ اہلِ قلب و نظر "زینہٗ عشقِ مجازی" سے بھی بامِ حقیقت تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ ہر مذہب اور عقیدے میں ہمیں کچھ لوگ ضرور ایسے ملتے ہیں جو میخانہٗ عشقِ خدا میں "مے عشقِ خدائی" کے میخوار ہو جاتے ہیں۔ ان میں کچھ تو ایسے ہیں جو پیرِ میکدہ کے حلقہٗ ارادت میں داخل ہونے کے باوجود شیخِ حرم سے بھی مفاہمت کی صورت معلوم کر لیتے ہیں۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو افراطِ بے خودی عشق میں مذہبی پابندیوں اور شرعی قوانین سے آزاد ہو جاتے ہیں ایسے لوگ حدودِ دیرو حرم سے یہ کہتے ہوئے گزر جاتے ہیں:

رسم فرسودہ نہیں شایانِ اربابِ نظر
اب کوئی منظر بلند از کفر و ایمان دیکھئے

مؤرخین کے خیال کے مطابق ایشیاء کی سرزمین کو یہ شرف حاصل ہے کہ دنیا کے تقریباً تمام مناسب جلیلہ کی ابتداء یہیں سے ہوئی اور اگر یہ کہا جائے کہ آفتاب روحانیت اسی افقِ نورانی سے طلوع ہوا ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ اگر بغور دیکھا جائے تو ہمیں یہ حقیقت معلوم ہوگی کہ مصر و عرب، ایران و چین و ہندوستان اپنی باطنی اور روحانی تعلیمات کے اعتبار سے تمام دنیا کے ملکوں میں ایک منفرد اور ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ تو ایسے میں

اگر ان کے ممالک میں روحانیت اور تصوف کا بازار گرم رہا ہے تو یہ اچھنبے کی بات نہیں دوسری جانب اگر یورپ کے حالات پر نظر دوڑائی جائے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تمام تر مادہ پرستی، بے راہ روی اور کھوکھلے پن کے باوجود یورپ میں بھی باطنی مسالک روحانی میلانات و مشاغل مروج رہے ہیں۔ قدیم اہل یونان کی

یونان کی ناستیت Gnaslicism میڈم کانٹیس

اور فینی لون کا Quietism اعتکاف و انزوا

چین میں TAO اس طریقے کا بانی Loatse تھا۔ اور اسی طرح مصر میں اشرفیات جدید، عرب و ایران میں اسلامی تصوف، اور ہندوستان میں فلسفہ ویدانیت روحانی تعلیمات کے علمبردار رہے ہیں۔

مولیناس کا Pietism، المانیو کا مسئلہ کشف Doctrine illiminati سویڈن برگ کے مکاشفات Visions ان سب میں باطنی ذوق کی کار فرمائی موجود رہی ہے۔ حکیم فیثا غورث نے اپنے شاگردوں کے لیے پانچ سال کی خاموشی اور سکوت کو حصولِ تعلیم کے لیے لازمی قرار دیا۔ اور اس عرصے کے بعد اس ریاضت کے بعد وہ طلباء کو روحانی مسلک میں داخل ہونے کی اجازت دیتا تھا۔ اسی طرح عہدِ وسطیٰ میں موجود کیتھولک صوفیا کے نزدیک تصوف اصل میں باطنی مذہب کا نام ہے اور دوسری جانب جو علم مشاہدے اور فکر کے نتیجے میں حاصل ہوا اسے علم الکلام کہا گیا جس میں بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ان باتوں پر اگر غور کیا جائے تو جو حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے تو وہ یہ ہے کہ صوفیاء میں باطنی ذوق کی وسعت مقبولیت و ہمہ گیری موجود ہوتی ہے۔ وہ مظہر ہے اس حقیقت کا کہ انسان میں یہ جذبہ فطرتاً و دیعتاً ہوا ہے اور جب یہ اپنی جولانی دکھاتا ہے تو مادیت کی تمام رکاوٹیں ختم ہو جاتی ہیں اور لگتا ہے کہ یہ کائنات روحِ لطیف کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ جنابِ من! ہمارے سامنے ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں جہاں اس شعلہٴ محبت و لگاؤ سے انسانی قلوب پلک جھپکنے ہی میں جل کر راکھ ہو گئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بن ادھم نے اسی برقی دلسوز کی تجلی کو محسوس کر کے ایک ہی لمحے میں تخت و تاج شاہی کو ٹھوکر مار دی اسی طرح خواجہ فرید الدین عطار کو چند ہی ساعتوں میں سرِ ریشہٴ محبت و معرفت مل گیا۔ وہ عطار تھے ایک دن ایک فقیر آیا اور گویا ہوا کہ کیوں وقت ضائع کرتے ہو؟ جواب میں آپ نے اسے جانے کو کہا۔ وہ وہیں لیٹ گیا۔ آپ نے جب اس کے قریب جا کر اسے حرکت دی تو وہ اصل حق چکا تھا۔ آپ پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ اور آپ پر عبرت طاری ہوئی اور دوکانِ رہ حق میں لٹادی اور کاروبار چھوڑ کر فقیر ہو گئے۔

تصوف کا جذب ایک شعلہ جاں سوز ہے اس کا مقام وہ ہے جہاں انسان کے ادارے میں پختگی اور استحکام نظر آتا ہے۔ اس میں آگ سے زیادہ تپش اور سیماب سے زیادہ تحریک اضطراب اور تڑپ دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کی وجہ سے اس کی وقت اور گفتار کا رنگ ڈھنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً اس کے رویے میں ایسی تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے جو بہت عجیب و غریب اور دلپذیر ہوتی ہے۔ ہست و نیست، وجود و عدم کی متضاد اور فرق حیثیت اس کو ایسی خصوصیات عطا کر دیتی ہیں کہ وہ تمام لوگوں کی نگاہوں کا مرکز و محور بن جاتا ہے۔ اگر اس کو مختصر آگہنا چاہیں یا اس کی وضاحت میں اختصار اپنائیں تو یہ کہنا بجا ہو گا کہ جو اس عالم نا آشنا کا آشنا ہو وہ بیگانہ، روزگار ہو کر رہا سالک راہ محبت و عشق و مستی دنیا میں موجود ہوتے ہوئے بھی بے خبر اور غیر موجود ہو جاتا ہے۔

غالب کے بقول:

ہم بجائے زابل عالم برکنا افتادہ ام

جوں امام سبھ بیروں از شمار افتادہ ام

یعنی ایک صوفی عالم کثرت میں بھی عالم وحدت کے مزے لوٹتا ہے۔ وہ اس کیفیت کو عقل و استدلال کی مدد سے دوسروں سے بیان نہیں کر سکتا البتہ اگر سامعین بھی اسی مقام کے لوگ ہوں تو وہ اپنے مشاہدات انہیں سنا کر اس لذت کا ذکر ضرور کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان مشاہدات کی صحت کو ماننے کے لیے عقل بے کار ہے۔ کیونکہ ہم کسی چیز کے ذہنی علم کو خارجی طور پر اسے دیکھنے، دوسری اشیاء سے ان کا تقابل کر کے اور اس کا تجزیہ اور تعریف کر کے ہی جان سکتے ہیں۔ اور حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ صورت صرف مادی اشیاء کو جاننے کے دوران پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس روحانی شے کا علم اسی وقت اور اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب ہم ویسے بن جائیں مثلاً اگر ہم محبت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو خود محبت کر کے دیکھیں اگر نغمہ کو سننا چاہتے ہیں تو پہلے نغمہ گری سیکھیں۔ اسی طرح اگر عرفان ذات الہی کے خواہاں ہیں تو پہلے ہمیں مظہر خدا بننا چاہیے۔ ابوالخفس الحداد نے تصوف کی تعریف کچھ یوں کی ہے:

"تصوف ہمہ ادب است"

اب یہ کہنا بجا ہو گا کہ دراصل تصوف یہ ہے کہ انسان پوری توجہ سے خدا کا ذکر اس قدر انہماک اور توجہ سے ہو کر اس پر وجد اور مستی کی کیفیت چھا جائے اور اسی طرح وہ احکام الہی یہ من و عن کرے۔ یعنی حق کو پکڑنا اور دنیاوی مال و متاع، جاہ و حیثیت اور مال و دولت کو یکسر ترک کرنا تصوف ہے۔

تصوف کی جامع و مانع تعریف بالکل ایسے ہی جیسے دریا کو کوزے میں بند کرنا۔ اس کی حدود اور کیفیتیں اس درجہ لطیف اور وسیع ہیں کہ زبان قلم اس کے بیان میں یکسر معذور ہے۔ البتہ کسی حد تک یہ کہنا بجا ہو گا کہ "تصوف" اس طریقے کا نام ہے جس پر خلوص، وفا تسلیم رضا کے ساتھ چلنے کی والے کی ذات عین حق سے آخری منزل پر واصل ہو جاتی ہے۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ ہر منزل پر پر دے اٹھتے جاتے ہیں اور دوئی کا بُد کم ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سالک کو عرفان ذات یا عرفان ذات الہی حاصل ہو جاتا ہے اور اسے اپنے آپ میں اور خدا میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ تصوف کوئی ریاضی کی طرح کی چیز نہیں جو سمجھانے پر سمجھ میں آجائے، اور نہ ہی کوئی سینما کی طرح کا کوئی فن ہے جو مختلف تصاویر کے آنکھوں کے سامنے آنے سے منظر عام پر آ سکے۔ اسی سبب سے بعض جگہوں پر یہ کہا گیا ہے کہ "تصوف ایک مہمل چیز ہے۔" یہ طنز اُکھا گیا ہے اس کی وجہ شائد یہ رہی کہ جس خیال یا شعر کے باوجود شوکت لفظی کے کوئی معانی اخذ نہیں کیے جاسکے تو اسے انتہائی آسانی سے کہا گیا کہ یہ خیال تصوف سے متعلق ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ تصوف تو دراصل ایسی چیز یا صلاحیت ہے کہ جس اپنے معانی سمجھانے کی ضرورت نہ کبھی رہی ہے اور نہ کبھی ہوگی۔ اس کا دعویٰ ہے کہ مجھے آزما کر دیکھو میں تم پر خود آشکار ہو جاؤں گی۔ جو فرد اس طریقے پر صدق دل سے عمل کرے گا۔ خود بخود سارے حجاب اس کی نظروں کے سامنے سے ہٹے جائیں گے اور پھر ایسی لذت کا حصول ممکن ہو گا جسے سمجھانے کے لیے الفاظ ہی نہیں سو جھیں گے۔

صَّکَاں رَاکَہْ خَبَرِ شَدِ خَبَرِشْ بَا زِ نَہْ آمَدِ

اہل تصوف کا عام قول ہے کہ "آؤ اور دیکھو" وہ کبھی بھی سمجھنے کی دعوت نہیں دیتے یہاں خاص انداز سے مشاہدے کا اہتمام کیا جاتا ہے اس مشاہدے کے لیے ظاہری آنکھ اور کان کی ضرورت نہیں کیوں کہ جو کیفیتیں اہل تصوف پر طاری ہوتی ہیں وہ الفاظ کا لباس کبھی بھی نہیں اوڑھ سکتیں اس لطف کو صرف دل زندہ ہی محسوس کر سکتا ہے اور اس کا نظارہ صرف اور صرف باطنی آنکھ ہی کا مقدر ہے۔

حق تو یہ ہے کہ جو شخص خود کو صوفی کہتا ہے تو اس کے تمام تر تجربات ذاتی مشاہدے پر مبنی ہوتے ہیں وہ دوسروں کے تجربات پر فخر محسوس نہیں کرتا۔ اس راہ سلوک پر وہ جو بھی قدم اٹھاتے ہیں وہ سچائی کے علمبردار ہوتے ہیں اور ان کا کوئی بھی عمل اخلاص سے عاری نہیں ہوتا۔ ہر راہ پر عشق ہی ان کا

رہبر اور رہنما ہوتا ہے۔ عشق ہی صوفی کو عمل پر اکساتا ہے اسے نہ سوز و زیاں کا خوف ہوتا ہے اور نہ ہی عبادت کی دھن اور نہ ہی وہ حورو و قصور کا امیدوار ہوتا ہے مولانا آسی کا قول ہے کہ:

مانگوں اگر بہشت تو دوزخ نصیب ہو
تیرے سوا ہو کچھ بھی اگر مدعائے دل

اس کو اشتیاق کہے یا جنون کہ جس عالم میں وہ اپنی ہستی کو ذات حقیقی میں فنا کرنا چاہتا ہے۔ اور اس خیال کی بناء پر اس کا جوش اسقدر زیادہ ہوتا ہے کہ پھر نہ تو اسے اپنے عزیز و اقارب کی کوئی پرواہ رہتی ہے اور نہ ہی دنیا اور اس کے لوازمات اسے اچھے لگتے ہیں۔ اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ جب اسے ذات الہی کا عرفان حاصل ہو جائے تو پھر بھی وہ ان سب سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے اور ان اشیاء مذکورہ بالا کی اس کے سامنے وقعت پیدا نہیں ہوتی۔ اہل تصوف کے ہاں اس منزل پر "ماو من" کا قصہ ہی باقی نہیں رہتا ان کو کعبہ و کلیسا ہر جگہ ایک ہی ہستی نظر آتی ہے۔ اور دیر و حرم میں بھی ایک ہی ذات کا عکس نظر آتا ہے۔ میر درد کہتے ہیں:

بستے ہیں ترے سائے میں سب شیخ و برہمن
آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا

ان باتوں کی وجہ سے وہ کسی فرقے اور گروہ مذہبی کو غلط اور برا نہیں جانتے اور وہ سب کو اسی ذات کا متلاشی سمجھتے ہیں۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو ہر کارواں کو ہم سفر بنا کر ان کی رفاقت کے لیے تیار ہوتے ہیں وہ کسی کے لیے دشمنی اور رقابت کے جذبے کو دل میں جگہ نہیں دیتے وہ سب کے دوست اور یار ہوتے ہیں اسی سلسلے میں ایک بزرگ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

کوئی دشمن ہو آسی یا مرا دوست
میں سب کا دوست کیا دشمن ہو کیا دوست

اہل تصوف کے حوالے سے ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب یا فرقہ یہ دعویٰ قطعاً نہیں کرتا کہ وہ ذات مطلق کے جمال و جلال پاسکتے ہیں انہیں کثرت میں بھی وحدت نظر آتی ہے اور اسی وحدت کے حصول کے لیے وہ سرگرداں رہتے ہیں اور جب وصل محبوب حاصل ہو جائے تو گویا ان کو

ان کی منزل مل گئی۔ ان کو راستے کی مشکلات قطعاً خوفزدہ نہیں کر پاتیں کیوں کہ بادہ کشانِ عشق کو ہر مصیبت پر لطف اور نشاط انگیز لگتی ہے۔

تصوف کی ہمہ گیری:

دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں تصوف کا عمل نہ ہو۔ مختلف عنوانات کے زیرِ سائے مشرق و مغرب تک اس کی رسائی اور کارستانیاں نظر آتی ہیں۔ تمام اہل تصوف کا عقیدہ ایک ہی ہے وہ سب ایک ہی جذبہ عشق سے سرشار ہو کر ایک ہی ذات کے عرفان و حصول خواہاں نظر آتے ہیں چونکہ تصوف کا بنیادی محرک "عشق" ہے اور یہ عشق ایسا عالمگیر جذبہ ہے کہ کوئی ملک اور کوئی قوم اور کوئی بھی طبقہ و انسان اس سے منکر نظر نہیں آتا البتہ کوئی عشق مجازی کا نعرہ لگاتا ہے تو کوئی عشق مجازی کا ترجمان نظر آتا ہے جو لوگ ذاتِ حقیقی کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں انہیں چہار سو صرف وہی نظر آتا ہے۔ درد کے بقول

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

دنیا کی ہر ہستی ان کے لیے ذات واحد کا آئینہ بن جاتی ہے بجز اس ذات کے جو ہر ایک میں پائی جاتی ہے ساری کائنات اعتباری معلوم ہوتی ہے اگر مشرق و مغرب کے اہل کمال کی فہرست پر غور کیا جائے تو پتا چلے گا اور یہ حقیقت منظر عام پر آئے گی کہ زمانہء قدیم سے تاحال بہت سارے ایسے اہل فکر و دانش رہے ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں تصوف کے قائل رہے ہیں۔

اس بحث سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تصوف کی عمارت دراصل روحانیت کی بنیاد پر استوار ہے۔ انسان کیونکہ روح اور جسم کا مرکب ہے تو جسم کے ساتھ ساتھ روح کی اہمیت بھی مسلم ہے اور روح کی پاکیزگی اور طہارت کے لیے قرآن و حدیث کے علم سے واقفیت اور اس پر عمل ناگزیر ہے۔ اس طرح اس علم سے مکمل واقف ہونا تصوف ہے اور اس علم پر دسترس رکھنے والے کو صوفی کہا جائے گا۔ یہی وہ علم ہے اور وہی ذریعہ ہے جس کی مدد سے انسان خدا کا براہِ راست مشاہدہ کر سکتا ہے اور خود آگہی اور خود شناسی کی منزل تک بخوبی رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ حیات، کائنات کے تمام سر بسنہ راز اسی ذریعے سے کھلتے ہیں۔ الغرض "تصوف" دین اسلام کی روح اور مذہب کی حقیقت ہے۔ تصوف کی بنیاد سراسر قرآن عظیم کی تعلیمات پر قائم ہے۔ یہ ایک مستقل علم کی حیثیت کا حامل ہے اس سلسلے میں "شیخ الاسلام" ذکریا انصاری کا قول ہے:

ترجمہ: "تصوف ایک علم ہے جس سے نفوس کی پاکی، اخلاق کی صفائی اور ظاہر و باطن کی آبادی و آرائستگی کے احوال معلوم ہوتے ہیں اور اس کا مقصد ابدی سعادت کا حصول ہے۔" (۲۸)

صوفیائے کرام اور اہل علم نے تصوف کی توضیح و تشریح میں اور اس کے تعارف میں کافی بحثیں کی ہیں اور اب تک کی گئی بحثوں کے نتیجے میں سینکڑوں کی تعداد میں کتب معرض وجود میں آگئی ہیں جن کے موضوعات میں تصوف کیا ہے؟ تصوف کسے کہتے ہیں؟ اور تصوف سے کیا مراد ہے؟ شامل ہیں ان کتب میں آئمہ نے مذکورہ بالا تمام پہلوؤں پر کماحقہ روشنی ڈالنی کی کوشش کی ہے۔

قبل ازیں کہ تصوف پر علمائے کرام اور صوفیائے کرام کے اقوال پیش کیے جاویں کہ تصوف کیا ہے؟ بہتر یہ ہے کہ لفظ تصوف کا مفہوم و مطلب بیان کیا جائے۔ اس سلسلے میں واضح رہے کہ "تصوف" اور "صوفی" جیسے الفاظ قرآن میں موجود نہیں ہیں تصوف کا شرعی نام "احسان" ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رقمطراز ہیں:

ترجمہ: "علوم احسان و یقین کہ آج کل تصوف کے نام سے مشہور ہو گئے۔۔۔ تصوف کی حقیقت جس کا نام عرف شرع میں "احسان" ہے۔" (۲۹)

ایک اور جگہ لفظ "احسان" جو تصوف کے استعمال ہوا۔ وہ کچھ یوں ہے کہ ایک بار حضرت جبرائیل امین نے حضور اکرم سے دریافت کیا کہ "احسان" کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:

ترجمہ: "اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، اگر اتنا مرتبہ تجھے حاصل نہیں تو یہ یقین کرو کہ وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے۔"

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لفظ "احسان" ہی "تصوف" کے لیے شریعت میں مستعمل ہے۔ تصوف کیا ہے؟ اس بارے چند مشہور صوفیائے کرام کے اقوال درج ذیل ہیں

"تصوف نیک خوئی کا نام ہے، جتنا کوئی شخص نیک خوئی میں بڑھا ہوا ہو گا، اتنا تصوف میں بڑھ کر ہو گا۔" (۳۰)

"تصوف وہ علم ہے جس سے تزکیہ نفوس، تصفیہ اخلاق اور تعمیر ظاہر و باطن کا علم ہوتا ہے تاکہ سعادت ابدی حاصل کی جاسکے۔" (۳۱)

"نفسانی لذتوں کا ترک کر دینا تصوف ہے۔" (۳۲)

"تصوف یہ ہے کہ حق تجھ تیرے وجود سے فنا کر کے اپنے ذریعے سے بقاء عطا فرمائے۔" (۳۳)

"تصوف دینا کی ساری طمع کو چھوڑ دینا ہے" (۳۴)

"تصوف قلب کو غیر اللہ سے خالی کرنا اور ذکر الہی سے آراستہ کرنا ہے۔" (۳۵)

"تصوف نام ہے نفس اور حرص و ہوا کی غلامی سے آزادی پانے کا، باطل کے مقابلے میں جرأت و مردانگی دکھانے کا، دنیاوی تکلفات کو ترک کر دینے کا، اپنے مال کو دوسروں پر صرف کر دینے کا اور دنیا کو دوسروں کے لیے چھوڑ دینے کا۔" (۳۶)

"تصوف دنیا کی دشمنی اور مولا کی دوستی کا نام ہے۔" (۳۷)

"علم تصوف اس علم کا نام ہے جو ولیوں کے دلوں میں اس وقت ظہور پذیر ہوتا ہے جب کتاب و سنت پر عمل کرنے سے وہ منور ہو جائے۔ پس جو کوئی ان دونوں پر عمل کرے گا، اس پر ایسے علوم و ادب اور اسرار و حقائق منکشف ہو جائیں گے جن کے بیان سے زبان عاجز ہے۔" (۳۸)

مذکورہ بالا تمام اقوال اپنی اپنی انفرادی حیثیت کے ساتھ موجود ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ لفظ "تصوف" کی کوئی جامع اور مکمل تعریف کی ہی نہیں جاسکتی کیوں کہ یہ ایک وجدانی اور ذوقی چیز ہے اسی لیے سب نے اپنے اپنے ذوق اور وجدان کے مطابق اس لفظ کو نئے نئے اور منفرد معنی کا جامہ پہنایا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ سب کو تصوف کے معنی سمجھنے اور سمجھانے میں مدد مل سکے۔ ان اقوال سے ایک اور حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنی اپنی سمجھ اور محسوسات کی بناء پر تصوف کی تشریح کی گئی ہے۔ صوفیائے کرام خود صوفی تھے اور راہِ طریقت کی مشکل اور پر پیچ اور دشوار گزار منزلوں کو سر کر کے کائنات کے مخفی اور سر بستہ رازوں پر سے پردہ ہٹانے میں کامر ان ہو گئے تھے۔ لہذا یہ کہنا بجا ہو گا کہ تصوف کی تعریف ان کے ذاتی احساس، تجربے اور تجزیے پر مبنی ہے۔

ان اقوال کی روشنی میں یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں تصوف صورت بدل بدل کر اپنی گلکاریاں دکھاتا رہا ہے اور ان متنوع تبدیلیوں کی وجہ سے صرف اور صرف یہ ہے کہ اللہ تک پہنچنے کی راہیں بے شمار ہیں اور صوفی کو اس بات میں اجازت اور اختیار ہے کہ وہ اپنی پسند کے مطابق ان راہوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے اور منزل مقصود تک پہنچ جائے اور عرفانِ ذاتِ الہی کے درجے پر پہنچ

جائے۔ اس سے ایک بات تو صاف ظاہر ہے کہ تصوف کی مختصر اور جامع تعریف ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ Mystic of Islam میں پروفیسر نکلسن رقمطراز ہیں:

ترجمہ: "اگرچہ عربی اور فارسی کتابوں میں اس کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں اور وہ تاریخی لحاظ سے کافی دلچسپ بھی ہیں لیکن ان سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ تصوف ناقابلِ تعریف ہے۔" (۳۹)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں تصوف ایک روحانی علم ہے اس کی بنیاد اسلام پر قائم ہے اور اس کا محور قرآن و حدیث ہیں اسی ذریعے سے ایک صوفی معرفت کی منزلیں طے کرتا ہے اور دنیاوی لذتوں اور جھمیلوں سے دور رہ کر اپنے دل کو اللہ کی یاد سے منور کرتا ہے اور ہر حال میں اپنے رب کی رضا اور خوشنودی کے حصول کا خواہاں ہوتا ہے اور اس سلسلے میں ہمہ وقت مصروف یاد الہی رہتا ہے۔

حضرت غوث اعظم کے قول کے مطابق تصوف کی بنیاد درج ذیل چیزوں پر ہے:

- ۱۔ سخاوتِ ابراہیمؑ
- ۲۔ رضائے اسحق
- ۳۔ صبرِ ایوبؑ
- ۴۔ اشارہ یحییٰؑ
- ۵۔ غیرتِ یوسف
- ۶۔ صوف پوشی، موسیٰؑ
- ۷۔ سیاحتِ عیسیٰؑ
- ۸۔ فقرِ محمد صلعمؐ (۴۰)

دورِ جدید میں تصوف سے عدم دلچسپی کوئی انوکھی اور غیر فطری بات نہیں اور نہ ہی معیوب بات ہے جو باعثِ شرم و عار ہو، لیکن دوسری جانب ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کی حیثیت سے تصوف سے شناسائی از حد ضروری بلکہ یوں کہنا بجا ہو گا کہ تصوف پڑھے اور سمجھے بغیر چارہ نہیں کیوں کہ ہمارا کلاسیکی ادب، کیا فارسی اور کیا اردو ادب سب تصوف کے مضامین سے معمور نظر آتے ہیں حتیٰ کہ جو شعراء صوفی شعراء نہ تھے انہوں نے بھی روایتی انداز میں ان مضامین کو شعر کے قالب میں ڈھالنا سم زمانہ کے مطابق ضروری خیال کیا اور جہاں کہیں یہ مضامین نہیں تو یہ رویہ وہاں ضرور نظر آتا ہے قرونِ وسطیٰ میں تصوف صرف مذہبی مباحث، اذکار و اشغال کے مخصوص طریقوں اور مخصوص طرزِ فکر کا ہی نام نہیں تھا بلکہ اور بھی بہت کچھ تھا وہ ایک سیاسی و سماجی تحریک کی بھی حیثیت رکھتا تھا جو عوام سے قربت، صناعتوں اور ہنروروں کے احترام اور محبت پر زور اور اقتدار پرستوں، حکمرانوں اور امراء و رؤسا کے ساتھ ابن الوقت علماء و فقہاء، قاضی و محتسب سے دوری اختیار کرنے کی تعلیم دیتا تھا۔

تصوف میں کسی بھی سالک کو منزل مقصود تک رسائی کے لیے ان چند مقامات سے گزرنا پڑتا ہے تب وہ کامیاب و بامراد ٹھہرتا ہے۔ ان مقامات میں

۱۔ شریعت ۲۔ طریقت ۳۔ معرفت ۴۔ حقیقت

یہ تصوف کے انتہائی اہم مقامات ہیں ان سے گزر کر ہی سالک کی آنکھوں کے سامنے سے تمام پردے ہٹتے ہیں اور وہ باتیں جو پہناں تھیں اس پر عیاں ہونے لگتی ہیں اور روح اپنے سرچشمہ سے جا کر مل جاتی ہے۔

۱۔ شریعت:

اس سے مراد اسلام کی شرع ہے۔ اس شرع کی پابندی سالک پر اس وقت تک لازم ہے جب تک وہ کوچہ تصوف میں رہتا ہے۔ اسے ہر کام کو کرنے کے لیے اپنے شیخ کی مرضی کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور شریعت کے مطابق عمل کرنا پڑتا ہے۔ شیخ کی رائے اور مرضی اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اپنے مرید کی رہنمائی کرتا ہے بلکہ کسی بھی مشکل وقت میں وہ مرید کی ڈھال بھی بنتا ہے۔

۲۔ طریقت:

شریعت کی منزل طے کر کے وہ طریقت کے میدان میں قدم رکھتا ہے یہ مقام دراصل تصوف کی ابتداء کا مرحلہ بھی تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ یہیں سے اسے اپنی منزل کا براہ راست سلسلہ مل جاتا ہے۔ اس سے قبل وہ ظاہری رسوم اور قواعد کی بندشوں کا سامنا کر رہا تھا۔ مگر اس درجے پر وہ ظاہر کی بجائے باطن کی طرف رجوع کرتا ہے یعنی عمل جسمانی کی منزل سر کر کے عمل روحانی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ بقول شخصے:

ع شریعت سر جھکانا ہے، طریقت دل لگانا ہے۔

۳۔ معرفت:

طریقت کی منزل کے بعد مرید معرفت کی جانب قدم بڑھاتا ہے۔ اس منزل پر حجاب و پردہ قریب قریب ختم ہو جاتا ہے اور اسے کشف و کرامات حاصل ہو جاتی ہیں۔ اسے درجے کو ہم فنا فی الرسول کا درجہ کہتے ہیں اس میں مرید جدھر دیکھتا ہے اسے رسول ہی کی ذات کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔

۴۔ حقیقت:

معرفت کا میدان طے کرنے بعد مرید کو حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس بحر بیکراں میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ اس منزل کو مرید کی حقیقی منزل کہنا بجا ہو گا کیوں یہی وہ درجہ تھا جس کے حصول کے لیے اس نے تمام ریاضت اور جانفشانی کی تھی۔ اس درجے پر پہنچ کر تمام پردے یکسر ختم ہو جانے سے سالک اور ذاتِ واحد کے درمیان کوئی پردہ باقی نہیں رہتا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ محور استغراق کا وہ عالم چھا جاتا ہے کہ اس کی بھی خبر نہیں رہتی کہ ہم کون ہیں؟ اور وہ کون ہے؟ یعنی من و تو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ یہ درجہ "فنائی الحق" کا درجہ کہلاتا ہے۔ اور فرط جذبات سے سالک بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے۔

"انا سبحانی ما اعظم الشانی انی انا اللہ لا اله الا انا۔"

فنا کی دو اقسام ہیں: ۱۔ خارجی ۲۔ داخلی

۱۔ خارجی:

اس درجے میں سالک کی اپنی کوئی خواہش یا رائے نہیں ہوتی بلکہ اس کے تمام اعمال و افعال اللہ کی مرضی و منشاء کے مطابق ہو جاتے ہیں یا یوں کہے کہ وہ بالکل بے حس ہو جاتا ہے وہ اس پر جو بھی حالات آجائیں وہ اسے رضائے الہی سمجھ کر خوش رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی دوسرا شخص بھی اسے تکلیف پہنچائے تو اسے بھی وہ رضائے ربی سمجھ کر رنجیدہ نہیں ہوتا۔ اس بارے میں میر کا کہنا ہے:

ہوئی ہے دل کی محویت سے یاں یکساں غم و راحت
نہ ماتم مرنے کا ہے میرؔ نہ جینے کی شادی ہے

۲۔ داخلی:

حالتِ اول میں سالک صرف ذاتِ الہی پر تکیہ کر لیتا ہے مگر داخلی فنا کا درجہ سابقہ درجے سے زیادہ افضل و برتر ہے۔ اس درجے پر صفاتِ انسانی صفاتِ ربانی سے بدل جاتے ہیں اور ایک جلالی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اس درجے میں سالک کی حیثیت محض ایک آلہ کی سی ہو جاتی ہے اور اس کا ہر عمل دراصل حق کا عمل ہو جاتا ہے کبھی وہ "انا الحق" کہتا ہے اور بھی "انی علی کل شیء قدیر" کہتا ہے۔

پہلے عالم میں سالک کی حیثیت مرید کی سی ہوتی ہے جبکہ دوسرے میں وہ پیر کی حیثیت پہنچ جاتا ہے یعنی کہ سالک نے جو سفر بقا کی منزل کے حصول کے لیے کیا تھا وہ فنا کے مرتبے کے حصول کے بعد ختم ہو جاتا

ہے۔ اور بقا کے درجے پر پہنچ کر وہ مقام اور حال کے قیود سے یکسر آزاد ہو جاتا ہے اور اس پر سربستہ راز اور اسرار عیاں ہونے لگتے ہیں اور یوں اپنی تمام خواہشیں ترک کر کے وہ بقاء حاصل کر لیتا ہے۔ اور بقاء تصوف کا وہ درجہ ہے جسے طے کرنے کے بعد اور کوئی درجہ باقی نہیں رہتا۔

اردو شاعری میں تصوف کا تعارف

اردو شاعری کے آغاز سے ہی تصوف پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے اردو شاعری کی تقریباً تمام اصناف سخن مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی اور باغی وغیرہ فارسی سے اردو میں وارد ہوئی ہیں لہذا اردو شاعری میں وہ تمام موضوعات سمٹ آئے جو کہ فارسی شاعری میں مروج و مستعمل تھے۔ فارسی کے بیشتر شعراء صوفی منش اور صوفی مزاج تھے۔ اسی وجہ سے فارسی شاعری میں زیادہ تر موضوعات تصوف، اخلاق، مذہب، عشق اور فلسفہ وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ لہذا اردو شاعری میں بھی مذکورہ بالا موضوعات کی بہار نظر آتی ہے۔

اردو شاعری کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کی خدمات مساعی سے چشم پوشی ممکن نہیں صوفیائے کرام نے اردو شاعری کی تمام اصناف کو رشد و ہدایت، وعظ و نصائح، تزکیہ روحانی اور تبلیغ دین کا ذریعہ بنایا۔ صوفیائے کرام کا کام کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ ان کا براہ راست تعلق اور واسطہ عوام الناس سے تھا۔ چنانچہ عوام تک اپنے مافی الضمیر کو پہنچانا اور ان تک پیغام پہنچانے کے لیے اور ان کے قلوب کو مسخر کرنے اور انہیں دین کی تعلیمات سے منور کرنے کے لیے واسطے کی صورت میں جو زبان درکار تھی وہ دراصل وہی عوامی زبان تھی جو انہیں با آسانی سمجھ آتی۔ اسی لیے صوفیائے کرام نے مقامی بھاشا کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اور اسی بھاشا نے آگے چل کر اردو کا جامہ اختیار کیا۔ اس دور میں جن معروف و مشہور صوفیائے کرام نے اردو شاعری کی غیر شعوری آبیاری کی ان میں خواجہ معین الدین چشتی فرید الدین شکر گنج، امیر خسرو، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، بندہ نواز گیسو دراز، شیخ بہاؤ الدین باجن، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شمس العشاق، شاہ میراں جی، شاہ برہان الدین جانم شاہ امین الدین اعلیٰ اور سید میراں حسینی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مندرجہ بالا سطور سے بات واضح ہوتی ہے کہ اردو شاعری ابتداء ہی سے تصوف جیسے موضوع کی ترجمان رہی ہے اور اردو شاعری کی ابتداء کے سلسلے میں صوفیائے کرام کی خدمات کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اردو شاعری کی مختلف اور مشہور اصناف یعنی غزل، مثنوی، نظم اور قصیدہ میں تصوف کی ابتداء اور اور موجودگی کے لیے درج بالا اصناف کا جائزہ لیے جانے پر درج ذیل صورت ظاہر ہوتی ہے۔

۱۔ اردو غزل میں تصوف:

عام تصوف یہی ہے کہ غزل اردو شاعری کے حوالے سے آبروئے شاعری ہے اس کی وجہ شائد یہ ہے کہ غزل میں موجود رمزیت اور ایمائیت ہی اس کو دیگر اصناف سے منفرد کرتی ہے اس کے علاوہ غزل کی ایک اور صفت یہ بھی ہے کہ اس میں بے شمار اور متنوع قسم کے موضوعات بخوبی سمائے گئے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ ان موضوعات کی ترجمانی واردات قلبیہ کی صورت میں ہوئی ہے جو کسی بھی قاری کے جمالیاتی تقاضوں کی بطور احسن تشفی کرتی ہے۔

عام طور پر غزل کا سب سے زیادہ اہم موضوع حسن و عشق اور ان کے معاملات و کیفیات کی ترجمانی ہے لیکن یہ بات بھی بہت اہمیت کی حامل ہے کہ دور جسے ہم غزل کے عروج یا ترقی کا دور کہیں وہ دور صرف وہی ہے جب اس صنف میں تصوف کے موضوع کو قبولیت حاصل ہوئی، اس سے صنف غزل کے موضوعات میں تنوع، رنگارنگی اور خیال میں رنگینی و رعنائی پیدا ہوئے اردو کے تقریباً تمام شعراء نے تصوف اپنا یا اس بات کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں:

تصوف برائے شعر گفتن خوب است

اردو کے مشہور صوفیائے کرام جنہوں نے غزل میں تصوف کی آبیاری کی ان میں امیر خسرو کا نام سرفہرست ہے امیر خسرو سلطان ناصر الدین کے دور حکومت میں ۱۲۵۳ میں پیدا ہوئے۔ ان کو دنیا طوطی ہند کے نام سے جانتی ہے۔ ان کی اہمیت ہر دور میں تسلیم کی گئی ہے اور بڑے بڑے ادباء اور شعراء نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور عالمانہ شان کا اعتراف کیا ہے۔ بحیثیت صوفی شاعر ان کا مرتبہ بے حد بلند ہے انہوں نے اپنے کلام خاص طور پر غزل میں تصوف کے مضامین شامل کیے اتنے بہترین انداز اور کمال مہارت سے انہیں بیان کیا کہ اس صنف کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ امیر خسرو کے کلام خاص طو پر غزلیات میں عشق حقیقی کا سوز و گداز، واردات قلبی، عرفان الہی اور تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کے خیالات و تجربات کی عکاسی نہایت لطیف بیرائے میں ہوئی ہے۔

ان کے ذاتی تجربے کے عکس کو ان کے صوفیانہ کلام اور خیالات میں واضح طور پر دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کلام کے چند نمونے درج ذیل ہیں:

جب یار دیکھائیں بھر دل کی گئی چناتا
ایسا نہیں کوئی عجب رکھے اسے سمجھائے کر
جب آنکھ سے جھل بھیا تڑپن لگا میرا جیا
حقا الہی کیا کیا آنسو چلے بھر لائے کر
جانا طلب گردندیکر طلب کس کی کروں
تیری جو ختیا دل دھروں ایک دن طو تم آئے کر

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز متوفی (۷۲۱ھ ۸۲۵ھ) بھی صوفیا میں اہم مقام کے حامل ہیں۔ ان متوفی کی تصانیف کی تعداد کافی زیادہ ہے اور ان میں سے زیادہ تر عربی، فارسی اور قدیم اردو میں ہیں۔ ان کے کلام میں خالص اسلامی تصوف کا رجحان غالب ہے ان کے خیال میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر صرف خدا کی ذات اور خیال میں ڈوب جانا ہی کسی بھی صوفی کی معراج ہے۔ اس طرح خدا اور بندے میں دوری اور بعد یکسر ختم ہو جاتا ہے۔ ان کی تصانیف جو ریختہ میں ہے۔ صرف اور صرف صوفیانہ مسائل یا مسائل تصوف کا مضمون لیے ہوئے۔ ان کا کلام ملاحظہ ہو:

شہباز حسینی کھوئے ہر دو جہاں دل دھوے کر
اللہ آپے یک ہوئے کر تب پاوے گا دیدار تو سا

سالک کو معرفت کی منزل اسی وقت نصیب ہو سکتی ہے جب وہ مشق اور مجاہدے سے لے گایہ ایک راہ سلوک کے مسافر کے لیے از حد ضروری ہے۔

خوگیر شریعت نعل بندزیں ہے طریقت زیر بند
حق ہے حقیقت پیش بند تنگ معرفت اختیار توں

قاضی محمود دریائی (۸۷۴ھ ۹۴۱ھ) ان کا شمار گجرات کے مشہور صوفیا میں ہوتا ہے۔ آپ کا دیوان قلمی ہے جو انجمن ترقی اردو پاکستان کی محافظت میں ہے اور کافی ضخیم ہے ان کی کلام میں متصوفانہ رنگ و آہنگ کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے ان کے کلام میں معشوق حقیقی کی دید کی تڑپ اضطراب و آرزو اور فراق کی کیفیت کی پیش کش میں سوز دل کی بھرپور ترجمانی ہوئی ہے۔

جاگ پیاری اب کیا سووے رین کیتی تیوں دن کیا کھووے
 سوئی میت پناوے کوئے کھڑے رہا کن سووے سوئے
 جس کے شہ کون اونگ نہ آوئے محمود سودھن کیوں سو رین گنواوے
 جاگ نہ شہ کون راوے سو کر میت پچھیں پچھتاوے

سید مبارک شاہ جیوگا مدھنی (م ۹۷۳ھ) بھی صوفی بزرگ اور شاعر گزرے ہیں قدیم اردو غزل میں تصوف کی ابتداء ترقی اور ترویج کے زمرے ان کی خدمات کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے ان کا دیوان جو "حواہر اسرار اللہ" کے نام سے موجود ہیں۔ اس دیوان کو سید ابراہیم نے مرتب کیا ہے۔ یہ تاحال انجمن ترقی اردو پاکستان کے زیر ملکیت ہے۔

ان کے کلام میں ہمیں واردات قلبی کی ترجمانی میں سوز و گداز کی کیفیت ملتی ہے۔ ان کے پورے کلام میں صوفیانہ مسائل کا بہترین استعمال نظر آتا ہے اور ہم اوست اور وحدت الوجود کے نظریے کی بہترین انداز میں تشریح اپنے کلام کے ذریعے کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں صوفیانہ رنگ کی خوبصورت جھلک ملا حظہ ہو:

یہ جو تو رہتا نہیں، ہو رمن دو کچھ سہتا نہیں
 مجھ جگ کہے جمنا نہیں، پیو باج مجھ کمتا نہیں
 دوئی وجود کو ہوتا یہ تو بات محال ہے لو گا
 ایک حقیقت ہے گی آہے جان نمائوں کا ہے بھوکا

قطب شاہی سلطنت علم و ادب اور تہذیب و تمدن کے حوالے سے بہت مشہور ہے کہ اس دور میں علم و ادب کی بہت خدمت ہوئی اور بہت خوبصورت فن پارے وجود میں آئے۔ اس دور اور اس سلطنت کا سب سے منور ستارہ اور ترقی کی بلندیوں پر چمکتا ستارہ قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ - ۱۰۲۰ھ) ہے۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ اگرچہ ان کے کلام کا اصل موضوع حسن و عشق ہے لیکن تصوف کے میدان میں بھی ان کی کوششیں نظر آتی ہیں۔

ان کی غزلوں میں خاص طور پر تصوف اور مسائل تصوف کا بیان نظر آتا ہے ان کے کلام میں حقیقت و معرفت اور سلوک کے اسرار و رموز کی گرہ کشائی کے ساتھ ساتھ عشق کے پاکیزہ خیالات کی عکاسی

اور وارداتِ قلبی اور جذباتِ اطہر کی تاثیر موجود ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو جو ان کے متصوفانہ خیالات کی بخوبی ترجمانی کرتا ہے:

میں نہ جانوں کعبہ و بت خانہ و میخانہ کون
دیکھتا ہوں پر کہاں دستا ہے تج مکھ کا صفا

سب اختیار میرا، تج ہاتھ ہے پیارا
جس حال سوں رکھے گا، ہے او خوشی ہمارا

تمہا ری یاد بغیر سنیں ہے بزمِ مورنگیں
کہ مرے بھاگ لکھیا ہے اے عشق روز است

قلی قطب شاہ کے بعد عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ-۱۰۸۳ھ) کا شمار بھی قطب شاہی دور کے معروف اور بہترین شعراء میں ہوتا ہے باپ دادا کی طرح یہ بھی ایک فہیم وزیرک اور اعلیٰ تعلیم سے بہرہ مند شخص تھا۔ ان کی غزلوں کا زیادہ تر حصہ تصوفِ مصفیٰ و پاکیزہ جذبات کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں انہوں نے اپنے اشعار میں مسائلِ تصوف انتہائی مہارت اور خوبصورتی سے بیان کیے ہیں۔ مثلاً

گر خدا بنی پر ہے تیری نظر اے کامیاب
تو خودی کا دور کر اول توں میانے تھے حجاب

عجب تیری پرت کا مست مد ہے
کہ نیں مستی کوں اس کی کچ ا تارا

غواصی ایک اور مشہور شاعر ہیں قطب شاہی دور کے ان کی معروفیت ایک مثنوی نگار کی حیثیت سے ہے۔ ان کی غزلیات تمام تر شاعرانہ خوبیوں کی مظہر ہیں جہاں تک متصوفانہ اشعار کا تعلق ہے تو یہ اشعار سادگی و سلاست اور شدتِ تاثیر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ان کی غزلیات میں زیادہ تر فلسفہ، فنا، بے ثباتی دنیا

آغاز انجام کی تشویش، عشق کی اہمیت و افادیت، بقا اور دنیاوی جاہ و جلال حشمت سے بیزاری وغیرہ انوکھے اور منفرد و یکتا و ممتاز انداز میں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

دیکھ ہر شے کوں توں عرفان کی اکھیاں سوئجھا
کہ کسی کا نہیں آغاز ہو انجام

منج غواصی کوں توں باطن میں نہ دیکھ اس سے جدا
شاہ رگ نمنے ہے نزدیک اگرچہ ہے بعید

اٹھارویں صدی عیسوی میں جن مشہور شعراء کے کلام میں اور خاص طور پر غزل میں تصوف کا رجحان نظر آتا ہے ان میں ولی اورنگ آبادی، مظہر جان جاناں، میر درد، میر اثر، سودا قائم چاند پوری، نظیر اکبر آبادی جوش آنا عظیم، غلام ہدانی مصحی، انشاء اللہ خان انشاود میر تقی میر وغیرہ کے نام کافی اہم اور قابل ذکر ہیں یہ وہی بزرگان ہیں اور وہی شعراء ہیں۔ جنہوں نے اردو غزل میں تصوف کی روایت کو آگے بڑھایا اور اس کی نشوونما میں کماحقہ حصہ ڈالا اور اردو غزل میں مسلک اور تصوف کے متنوع مسائل کی آبیاری کی۔

ولی اورنگ آبادی (۱۶۶۸ء-۱۷۰۷ء) کو تصوف سے خاص قلبی لگاؤ تھا وہ ایک صوفی منش انسان تھے اور اپنی زندگی بیشتر حصہ انہوں نے خانقاہوں اور درگاہوں میں گزار کر راہ سلوک کی منزلیں طے کی تھیں اور درس معرفت سے بہرہ ور تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں تصوف کے مختلف رموز و نکات کی عقدہ کشائی میں جدت کے ساتھ ساتھ سادگی، سلاست اور دلکشی بھی قارئین کو متاثر کرتی ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

آج سر سبز کوہ و صحرا ہے
ہر طرف سیر ہے تماشا ہے
ہر ذرہ عالم میں ہے خورشید حقیقی
یوں بوجھ کے بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا

جو پی کے نام پاک پہ بھی سوں فدا نہیں
راضی کسی طرح سستی پر خدا نہیں

منظہر جانجاناں (۱۶۹۸ء-۱۷۸۱ء) ان کا شمار بھی ایک صوفی اور باعمل بزرگوں میں ہوتا ہے۔ انہوں
عوام الناس کی رشد و ہدایت کے لیے مکاتیب، ملفوظات اور شعر و شاعری کو اپنا ذریعہ بنایا اور اس سے مدد لی۔
گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی غزلوں اور تحاریر کا خمیر صوفیانہ مذاق اور عارفانہ بصیرت سے اٹھا ہے جس کی
ضوفشانی سے دل سوز و گداز اور نورانیت کی کیفیت حاصل کرتا ہے۔

ان کے صوفیانہ کلام کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان کا تمام ترکلام ان کے ذاتی تجربے اور قلبی
واردات کا نچوڑ ہے انہوں نے بہترین مہارت اور کمال فنکاری سے متصو قانہ خیالات کو سادگی اور سلاست کے
ساتھ شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جذبات عشق حقیقی نے ان کے دل کو سوز و گداز اور کی جس
کیفیت سے دو چار و سرفراز کیا وہی سوز و گداز ان کی غزلوں میں بھی در آیا ہے۔ اور اسی کو تصوف کی و معرفت
کی روح کہا جاتا ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

الہیٰ درد و غم کی سرزمین کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشم تر سے مینہ نہ برسائی

خداوندا اٹھالے ہجر کے درمیاں سوں پردے
ہمیں صیاد کے اب دام میں ڈالا ہمیں پردے

جسے شعور ہے کچھ بھی وہ اس قدر جانے
قضا بھی کچھ ہے اگر بندہ رضا نہ رہے
سحر اس حسن کے خورشید کوں جا کر دیکھا
ظہور حق کو دیکھا، خوب دیکھا، باضیاء دیکھا

سراج اورنگ آبادی (۱۷۱۰ء-۱۷۶۳ء) اورنگ آباد کے علاقے سے تعلق رکھنے والے صوفیائے
کرام میں کافی مقبولیت اور شہرت رکھنے والے صوفی ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک خدا رسیدہ

بزرگ اور علائق دنیا سے بے نیاز ولیوں میں سے ایک تھے۔ ان کی اس حیثیت کے ساتھ ساتھ یہ ایک مشہور و معروف شاعر بھی تھے ان کا خاص میدان غزل گوئی تھا۔ ان کی غزلیات میں انہوں نے مسائل تصوف اور ان کی نشوونما و آبیاری کے لیے لازم داخلی جذبات و کیفیات، احساسات کا پورا پورا التزام و خیال رکھا۔ ان کی غزلوں میں عشق حقیقی کا دروس و گداز، تپش، تڑپ، اضطراب، ہیجان اور کسک کی ترجمانی بخوبی دیکھی و محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہ اکثر اشعار میں تصوف کے اسرار و رموز کو پردہ خلوت سے پردہ جلوت میں لے آتے ہیں مندرجہ ذیل اشعار میں صوفیانہ خیالات و احساسات کی عقدہ کشائی، وسعت مشاہدہ، بے ساختگی، سادگی و سلامت خلوص و پاکیزگی کا استعمال قابل ستائش ہے۔

شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بجیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

عالم دیوانگی کیا خوب ہے
بے کسی کا واں کسی کو غم نہیں

جلتا ہے سراج آتش ہجراں میں صنم کی
کس دن دلِ غمگین کوں میرے شاد کرے گا

اردو شاعری میں خواجہ میر درد (۱۱۲۳ھ-۱۱۹۹ھ) کا نام شامل کیے بغیر تصوف کی تاریخ دہرانا ناممکن ہے۔ آپ کا رتبہ نہایت بلند ہے۔ یہ صوفی باصفا تھے اور صوفیانہ شاعری کے گوہر آبدار تصوف اور فقری ان کو ورثے میں ملی تھی۔ ان کے ہاں تصوف کے گہرے اور مشکل مسائل بھی نہایت سلاست و سادگی سے بیان ہوئے ہیں اور یہی نہیں بلکہ بلا کی دلکشی و جاذبیت کے حامل بھی ہیں۔ خیالات کی بلندی اور جذبات کا جوش اس بات کی علامت ہے کہ وہ جو کچھ شاعری میں بیان کر رہے ہیں وہ ان کا ذاتی مشاہدہ ہے۔ ان کے صوفیانہ کلام کا کیف و سرور ملاحظہ ہو:

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

معرفت کے حصول کے لیے دل کا صاف اور پاک ہونا از حد ضروری ہے۔

مثال عکس جو کوئی کہ پاک طینت ہے

جہاں صفا ہے وہ ہیں بود و باش کرتے ہیں

آپ کے کہنے کے مطابق صوفی کی تمام آرزوؤں، تمناؤں، خواہشوں اور تمام تراضی و اضطراب اور تڑپ کا منبع و مقصد طلبِ محبوب حقیقی ہی ہونی چاہیے:

تمنا ہے تیری، اگر ہے تمنا

تیری آرزو ہے، اگر آرزو ہے

مرزا رفیع سودا (۱۱۲۵ھ-۱۱۹۵ھ) انہیں خاقانی ہند کے لقب سے نوازا گیا۔ مرزا سودا نے شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے غزلوں میں تصوف کی چاشنی بھی نظر آتی ہے اور ہی اس وجہ سے بھی ہے کہ آپ کے زمانے میں تصوف بھی ایک اہم موضوع کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور تقریباً تمام شعراء اس موضوع میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ مرزا رفیع سودا اگرچہ ایک صوفی منش شاعر نہیں تھے مگر انہوں نے انتہائی کمال سے اپنی شاعری میں تصوف کے حقائق و معارف کی عکاسی کی ہے۔ ان کے صوفیانہ اشعار میں عشق حقیقی کا سوز و گداز اور اضطراب و تڑپ موجود ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

سودا نگاہ دیدہ تحقیق کے حضور

جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہے آفتاب کا

جز و کل میں فرق اتنا ہی فقط ہے اعتقاد

ورنہ جس خرمن کو دیکھا بالحقیت خانہ تھا

میر تقی میر (۱۷۲۲ء-۱۸۱۰ء) انہیں خدائے سخن کہا جاتا ہے۔ انہیں اپنی شاعرانہ مہارت، قدرتِ زبان اور فصاحتِ بیان کی بنا پر رہتی دنیا تک یاد کیا جاتا رہے گا۔ ان کی شاعری کا اصل محور عشق ہے جو عشق مجازی کی منازل طے کر کے عشق حقیقی کے حدود میں داخل ہوا ہے۔ ان کی غزلیات میں ہمیں صوفیانہ تپش اور سوز اور تڑپ بے حد کمال تک نظر آتی ہے زبان و بیان کی سلاست و نرمیت، لہجے کی صداقت اور خلوص اور دل کی گداختگی ان غزلیات کا اصل جوہر ہیں۔ غرض یہ کہ انہوں نے اپنی غزلوں میں تصوف کو بہت خوبی سے برتا ہے وہ کہتے ہیں:

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اسی کا ہی ذرہ ظہور تھا

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

قائم چاند پوری وفات (۱۲۱۰) ہجری کو شعری ذوق قدرتی طور پر ودیت کیا گیا تھا۔ ان کی غزلیات میں تخیل کی بلندی، تازگی فکر اور منفرد رنگ و آہنگ واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ نہایت صاف اور شستہ زبان سلیس اور عام فہم کلام کی وجہ سے تمام شعراء ان کے شاعرانہ عظمت کو ماننے ہیں۔ ان کے صوفیانہ کلام میں صوفیانہ غزلیات کا نہایت منفرد انداز ہے۔ ان غزلوں میں سادگی و سلاست، دلکشی و جاذبیت کے ساتھ ساتھ جذب کی کیفیت بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے چند متصوفانہ اشعار ملاحظہ ہوں:

سالک عشق کو لازم ہے کرے ترک قیود
جو شناور ہے اگر ہو وہ برہنا بہتر

اُٹھ جائے گر یہ بیچ کا پردہ حجاب سے
دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا

اسد اللہ خاں غالب (۱۷۹۲ء-۱۸۶۹ء) ان کا شمار اردو شاعری کے آسمان کے ان تابناک ستاروں میں ہوتا ہے جس کی تابناکی میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہو رہا ہے یہ وہ پہلے شاعر ہیں جن کی شاعری میں غور و فکر کا مادہ ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں حیات و کائنات کے بہت سارے مسائل کی عکاسی نظر آتی ہے۔ احساسات، جذبات اور کیفیات کی ترجمانی میں سادگی اور پرکاری، شائستگی اور جدت طرازی ان کے کلام کے اوصاف ہیں۔ غالب صوفی باعمل نہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے جس فنکارانہ انداز میں صوفیانہ افکار کو اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے وہ ان کی عالمانہ شان اور کمال فن کی دلیل ہے۔ صوفیانہ اشعار کا نمونہ ملاحظہ ہو:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

گو میں رہا رہیں ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تک ظرفی منصور نہیں

۲۰ صدی کے شعراء کے ہاں بھی ہمیں تصوف کا وجود ملتا ہے۔ حسرت موہانی (۱۸۸۱ء-۱۹۵۱ء) کی شاعرانہ انفرادیت اپنی جگہ مسلم ہے زبان و بیان کی تمام خوبیاں ان کے کلام کا حصہ ہیں۔ ترنم اور تغزل ان میں زیادہ نمایاں اوصاف ہیں ان کے کلام میں محض حسن و عشق کی واردات و کیفیات اور گل و بلبل کا ذکر ہی نہیں ملتا بلکہ تصوف کے حقائق و معارف کا گہرا رنگ بھی ان کے کلام کا خاصا ہے۔ ان کے متصوفانہ اشعار کی لطافت و تاثیر ملاحظہ ہو:

پہلے اک ذرہ ذلیل تھا میں
تیری نسبت سے آفتاب ہوا

تم پر مٹے تو زندہ جاوید ہو گئے
ہم کو بقا نصیب ہوئی فنا کے بعد

۲۰ ویں صدی میں اردو غزل میں تصوف کا رجحان اکبر الہ آبادی، شاد عظیم آبادی، ریاض خیر آبادی، فانی بدایونی، حسرت موہانی، اصغر گونڈی، جگر مراد آبادی اور اقبال کے ہاں ملتا ہے۔ اقبال (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) فلسفی بھی ہیں اور ایک عظیم شاعر بھی۔ اقبال کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جو اپنی راہ الگ متعین کرتے ہیں انہوں نے شاعری کو روایت کی زنجیر سے آزاد کر کے صحت مندرجہ جانات سے روشناس کرایا اور شاعری کو ایک پیغمبری آلہ کار بنایا۔ صوفی باپ اور عالم استاد کی تعلیم نے ان کی عقل اور شعور کو پختگی کے مدارج طے کروائے۔ اقبال کے کلام کے مطالعے کے بعد یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شاعری کا ملکہ آپ کے پاس خداداد طور پر تھا لیکن آپ کے ذاتی تجربات اور افکار نے اسے نکھار اور خوبصورتی

بخشی فنی مہارت اور قدرت کے وسیلے انہوں نے اپنے کلام کو بے حد دلنشین اور موثر بنایا اور پوری دنیا کی توجہ حاصل کی۔ عارفانہ رنگ و آہنگ سے لبریز کلام اقبال ملاحظہ ہو:

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ میرا انتظار دیکھ

اردو نظم میں تصوف:

کسی ایک موضوع کو مسلسل بیان کرنا نظم کا وصف ہے اردو نظم میں بھی اسی اصول کے پیش نظر کام ہوتا ہے اور پھر اگر بغور دیکھا جائے تو یہ صنف غزل سے یکسر مختلف ہے۔ اردو شاعری میں نظم کی موجودگی کا پتہ بالکل ابتداء سے لگتا جاتا ہے۔ دکن میں بہترین اور عمدہ اخلاقی اور صوفیانہ نظمیں تخلیق ہوئیں اور اگر تصوف کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس شعبہ شاعری یا صنف شاعری کے سلسلے میں صوفیاء کے کام کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ صوفیائے کرام نے تصوف، تبلیغ اور رشد و ہدایت کے لیے نظم کو ہی ذریعہ بنایا ان صوفیائے کرام میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے ان کی متصوفانہ نظمیں ان کی قلبی واردات کی شاہد و ترجمان ہیں نمونہ ملاحظہ ہو:

او معشوق بے مثال نور نبی نہ پایا
اور نور نبی رسول کا میرے جیو میں بھایا
اپیں اپیں دیکھاؤ نے کیسی آرسی آیا

سید شاہ علی جیو گادھنی کی صوفیانہ نظمیں ان کے تجربات و مشاہدات و احساسات کا جوہر نظر آتی ہیں۔ وحدت الوجود کے فلسفے کو اپنی نظم میں کتنی خوبی سے سمویا ہے ملاحظہ ہو:

چاؤ اٹھیا اس میرے ساتھی کی ہو جگ بھیس ہو آؤں
کہیں سو رجا کہیں سو پر جا کہیں سو بند آپ کہاؤں
کہیں سو عاشق ہو کر راؤں کہیں عارف ہوئے بچھالوں
کہیں موحد کہیں محقق کہیں سو جانوں کہیں نہ جانوں

قلی قطب شاہی خاندان کا سب سے معروف شاعر محمد قلی قطب شاہ نے بھی تصوف کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ ان کے کلام میں بھی موضوعات کا تنوع اور وسعت نظر آتی ہے۔ ان موضوعات میں ہندوستانی معاشرہ میں رائج دستور، رسم و رواج، تہوار، میوے، ترکاریاں اور پرندوں کے علاوہ تصوف کے موضوع پر بھی کام کیا گیا ہے۔ درج ذیل میں کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

تمہیں جگ کا سامیا یا حفیظ تمہیں جگ کوں سر جا یا یا حفیظ
جو کوئی در ماندے ان کو سدا تمہیں کرے ہارا دیا یا حفیظ

نظیر اکبر آبادی کو اردو نظم کے ارتقاء میں اہم حیثیت حاصل ہے ان کے ذکر کے بغیر اردو نظم کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ ان کی نظموں میں موضوعات کا کافی تنوع ملتا ہے۔ معمولی سے معمولی موضوع مثلاً مفلسی، غریبی، آٹا، دال، روٹی، چاول، جاڑا، گرمی برسات، اندھیری رات، ہولی، دیوالی، عید، شبِ برات وغیرہ کو انہوں نے اپنی نظموں میں پیش کیا اور تصوف کو بھی بہت خوبصورتی سے اپنے کلام کا حصہ بنایا ہے۔ نظم "انعام خدا" میں تصوف کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے وہ یوں رقمطراز ہیں:

قادر، قدیر، خالق و حاکم و حکیم ہے مالک، ملکِ حق و توانا قدیم ہے
دونوں جہاں میں ذات اسی کی کریم ہے یعنی اسی کا نام غفور الرحیم ہے
غیر از خدا کے کس میں ہے قدرت جو ہاتھ اٹھائے مقدور کیا کسی کا وہی دے وہی دلائے

بے ثباتی دنیا کے موضوع پر بھی انہوں نے لکھا نظم "بے ثباتی دنیا" کا نمونہ ملاحظہ ہو:

یا دولتوں کے سامنے آ کر تھا یک دریا بہا
لے کر زمیں تا آسماں، دولت میں پھرتا تھا پڑا
یا ہو کے مفلس بے نوا پھرتا ہے دانے مانگتا
جب آگئی سر پر اجل ایک دم سب کچھ مٹ گیا
گریوں ہوا تو کیا ہوا اور ووں ہوا تو کیا ہوا

محمد حسین آزاد کے کلام میں بھی تصوف کا رنگ جھلکتا ہے ان کا کلام دلکش و دلاویز ہونے کے ساتھ ساتھ زباں و بیاں کے حاکمانہ تصور کا ثبوت ہے۔ "معرفت الہی" امن کی ایک متصوفانہ نظم ہے اور بے ثباتی دنیا کے موضوع پر طبع آزمائی کی گئی ہے برزبانِ برگ دنیا کی بے ثباتی کا حال سنئے:

سبز کو میلی تھا نکالا سر پردہ کو نیل تھی غیرت گل تر
 کھائی جو میں نے اس چمن کی ہو دیا شاخ و شجر کو برک و نوا
 سیر چمن قدم پہ آیا راس ہو گیا ہر درخت خضر لباس
 ہر خزاں کو بہار لازم ہے ہست کو نیستی ہی لازم ہے

نظم طباطبائی کی نظم "جلوہ حسن فلسفی کی نظر میں" میں وحدت الوجود کے نظریے کا ذکر اور ترجمانی بطریق احسن کی گئی ہے۔ اس نظم کا بنیادی پیغام یا نکتہ یہ ہے کہ کائنات اور اس میں موجود ہر چیز میں جلوہ حسن خالق موجود ہے۔ اور مظاہر کائنات میں سے ہر شے میں خیر کا پہلو نمایاں ہے اور کائنات کی ہر شے سے حسن خالق ٹپکا پڑتا ہے یا یوں کہے کہ ہر چیز خالق کائنات کے شاہد ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پیدا ہے صاف علت و معلول کا یہ ربط
 صانع ہے خود جمیل تو صنعت جمیل ہے

وحید الدین سلیم مناظر قدرتی اور حسن فطرت کے دلدادہ اور شیدائی ہیں ہر حسین شے میں خالق باری کے حسن کے جلوؤں کو محسوس کرتے ہیں کہ حسن ازل کیسے ان مناظر اور حسین چیزوں میں پذیر ہوتا ہے "حسن کی زبان سے" ان کی ایک مشہور نظم ہے جس میں وہ وحدت الشہود کے نظریے کو پیش کرتے ہیں اور ان کا یہ خیال ہے کہ حسن ازل کی جلوہ گری دنیا کی ہر چیز سے عیاں ہے۔

جہاں میں ضیا میری میں جلوہ کار ہوں
 میں رونق اس چمن کی ہوں میں فصل نو بہار ہوں
 میں زیب کائنات ہوں، میں فخر روزگار!
 میں شاہد نہفتہ کا جمال آشکار ہوں
 کہ آئینہ دہر کے، میں عکس کردگار ہوں

علامہ اقبال کی شاعری میں نادر خیالات کے اظہار سے انہیں اردو شاعری میں خاص مقام و مرتبہ حاصل ہے ان کی مخصوص شاعرانہ قابلیت نے انہیں عام و خاص عوامی اور خواص کے دونوں طبقوں میں مقبولیت اور ہر دلعزیزی بخشی۔ علامہ اقبال بحیثیت نظم و نگار زیادہ مقبول ہوئے۔ ان کا کلام اور خصوصاً نظم نگار نظموں میں متصوفانہ خیالات کی عکاسی ملتی ہے۔

مسک تصوف کی رو سے "عقل" کی نسبت "جنوں" زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ یہی وہ ذریعہ، راستہ اور وسیلہ ہے جو ایک صوفی اور سالک کو رب جلیل کے قریب کر دیتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس جدائی اور دوئی صوفی کے لیے جان لیوا ہوتی ہے اور فراقِ محبوب میں دیوانگی کا شکار ہو کر پکارتا ہے:

سبز کو میلی تھا نکالا سر پردہ کو نپل تھی غیرت گل تر
یہ کیفیت ہے میری جانِ شکیبائی کی مری مثال ہے طفلِ صغیر تنہا کی
اندھیری رات میں کرتا ہے وہ سرودِ آغاز صدا کو اپنی سمجھتا ہے تھیر کی آواز
یونہی میں دل کو پیامِ شکیب دیتا ہوں شبِ فراق کو گویا فریب دیتا ہوں

اردو مثنوی میں تصوف:

اردو شاعری کی شعری اصناف میں مثنوی ایک قدیم اور مقبول صنف ہے۔ اس کی شکل و صورت بیانیہ اور وضاحتی ہوتی ہے اور ایک مضمون و سبج کو تسلسل اور ربط کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ مثنوی کی ہیئت ایسی ہے کہ اس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور بحر بھی تمام اشعار کی ایک ہوتی ہے۔ صنفِ مثنوی کے موضوعات میں شاعر کو دسترس حاصل ہے کہ وہ جس بھی موضوع کا انتخاب کرے۔ وہ آزاد ہے "تصوف، فلسفہ، مذہب، پند و نصائح، داستانِ حسن و عشق، میدانِ جنگ کے واقعات، اخلاق و عطا، شادی بیاہ کے رسوم، مافوق الفطرت، عناصر کے حیرت انگیز کارنامے سبھی کچھ اس صنف کا موضوع ہو سکتے ہیں۔

اردو شاعری میں صنفِ مثنوی آغاز سے ہی مذہبی عقائد اور متصوفانہ خیالات کے اظہار کے مشہور و مقبول رہی ہے۔ علماء اور صوفیائے کرام نے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے صنفِ مثنوی کو استعمال کیا اور اس کا سہارا لیا اس کی وجہ شائد یہ ہے کہ یہ صنف بہ اعتبار وسعت بہترین تھی۔

اردو کے مشہور اور قدیم صوفیائے کرام جن کی مثنویوں میں تصوف کی جلوہ گری ملتی ہے ان میں بابا فرید گنج شکر، شاہ محمد جیو گامدھنی، خوب محمد چشتی، شاہ میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین جانم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

بابا فرید گنج شکرؒ کی مثنوی میں مسلک تصوف کی عکاسی اور اظہار میں بلا کی چاشنی، دلکشی اور لطف کا حصول ہوتا ہے اس مثنوی کی روانی اور تسلسل بھی کمال کا ہے اور زبان کی قدامت بھی اسے متاثر نہیں کر سکی۔ ملاحظہ ہو:

تن دھونے سے دل جو ہوتا پوک	پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک
ریش سببت سے گر بڑے ہوتے	بو کڑوں سے نہ کوئی بڑے ہوتے
خاک لگانے سے گر خدا پائیں	گائیں، بیلوں بھی واصلان ہو جائیں
عشق کا رموز نیارا ہے	جز مددِ پیر کے نہ چارا ہے

شاہ علی جیو گامدھنی ایک صوفی بزرگ گزرے ہیں ان کی مثنوی میں تصوف کے رموز و نکات کی عکاسی بہترین انداز میں نظر آتی ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

کبھی سو لیا دے بھیس رکا سا	ہو کر چندا تارے باسا
دیہ الا لا ہج بکھیرے	روپ آپنڑے آپ ہی پھیرے
مکھ پر بال بکھیر سو ساتھی	چھپ کر ہو وے رات سنگھاتی
وے سنبھال سو بکھرے کیسا	دن ہو آ وے سورج بھیا

اردو کے مشہور صوفیاء میں شاہ میراں جی شمس العشاق کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ آپ کی علمی اور ادبی خدمات نے بیجاپور میں زبانِ اردو کے فروغ و ابلغ و نشوونما و ترقی میں انتہائی اہم کردار ادا کیا اور یہی وجہ ہے کہ انہیں کسی صورت فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ایک مثنوی میں خالق کائنات کی تعریف و توصیف کا انداز کچھ یوں نظر آتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن	الرحیم تو سبحان
یہ سب عالم تیرا	رازق سبھوں کیرا
تجھ بن اور نہ کوئے	نہ خالق دو جا ہوئے تجھ نرتا لومر
جسے تیرا ہوئے کرم نہ ٹوٹے سبھی کا بھرم	جائے اور پوری صفت لکھانے
ہے تیرا انت نہ یار	کس موکھوں کروں اچار

شاہ برہان الدین جانمؒ بھی بیجاپور کے مشہور بزرگ گزرے ہیں اردو مثنوی میں تصوف کے حوالے سے ان کا ذکر از حد ضروری ہے ان کی ایک مثنوی کا ابتدائی حصہ ملاحظہ ہو:

الہی کلیاں کھول حاجات کیاں بر آوئے مراد اس مناجات کیاں
ترا ناؤ کیلی ہے ہر گنج کا ترا رحم مرحم ہر رنج کا
کیا کوچہ سرمست اس اٹھار سوں کہ چن سے محمد کے گلزار کوں
کیا آپ اول اپیں ابتداء رکھیا ناؤ اپس اوپر کر خدا

نہ صورت کسی شے کی تھی درمیاں
نہ تھا ناؤں کے گاؤں کا کہیں نشان

ان صوفیائے کرام کے بعد ہمیں جن مشہور مثنوی نگاروں کے کلام میں تصوف کی جھلک نظر آتی ہے ان میں قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، ابن نشاطی، مقیمی، نصرتی، شاہ امین الدین علی بصری، وجدی، شاہ حاتم، ولی، سراج، میر اثر، میر تقی میر، سودا، ناسخ، میر حسن، راسخ، شوق لکھنوی اور اقبال کا نام اہمیت کا حامل ہے۔

ملا وجہی کی مثنوی قطب مشتری ایک طبعزاد مثنوی ہے یہ مثنوی ملا وجہی کے نادر خیالات اور جدت طرازی کی غماز ہے۔ اس کی ابتداء حمدیہ کلام سے ہوتی ہے ملاحظہ کیجئے:

توں اول توں آخر توں قادر ہے توں مالک توں باطن توں ظاہر ہے
توں محفی، توں مبدی توں واحد سچا توں تو اب توں رب توں ماجد سچا
توں باقی توں مقیم توں ہادی توں نور توں وارث، توں منعم توں صبور

ملک الشعراء غواصیؒ نے اپنی مثنوی "میناستونتی" میں اللہ کی حمد و ثنا سے ابتدائی ہے وہ کہتے ہیں:

کہوں حمد میں پاک رحمان کا کہ او حمد زیور ہے ایمان کا
جمع حمد اس کوں سزاوار ہے کہ کن جگ کوں پیدا کر نہار ہے
او خالق ہے سب خلق کا خاص وعام اور مالک ہے ملک سب کا تمام
اور رازق ہے رزق کا دینہار کہ دینے کو اس کے کرے کون شمار

مثنوی نگار کی حیثیت سے نشاطیؔ بھی ایک خاص مقام کے حامل ہیں۔ ان کی مثنوی "پھولبن" کا شمار دکن کی مشہور و مقبول مثنویوں میں ہوتا ہے۔ اس کا آغاز بھی رب العلیٰ کی تعریف و توصیف اور حمد و ثناء سے ہوتا ہے:

نخستیں یو بنا کرتا ہو در توحید سبحانی جنے دو حرف میں ظاہر کیا اسرارِ پنهانی
اول میں حمد رب العالمین کا دل و جان سو کہوں جاں آفریں کا
خداوند تجھے ہے جم خدائی ہمیشہ تجھ کوں سا بے کبریائی

"گلشن عشق" نصرتی کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے اس میں بنیادی طور پر ایک عشقیہ داستان بیان کی گئی ہے لیکن ابتداء میں حمد یہ اشعار کہتے گئے ہیں باری تعالیٰ کی مدح میں نصرتی کا انداز ملاحظہ ہو:

صفت اس کی قدرت کی اول سراؤں دھریا جن نے یو گلشن عشق ناؤں
کیا گرم عشق کا تس ابھال یوم باغ آفرینش کا پکڑ جاں
رنگا رنگ بے گل یو بن باس ہے او ہر گل تجھ عشق کی باس ہے

"رموز اسالکین" شاہ امین الدین علی کی مشہور مثنوی ہے۔ اس میں انہوں نے عقیدہ وحدت الوجود

اعلیٰ اور بے ثباتی کائنات، فنا و بقا کے مسائل پر بحث کی ہے:

ادنیٰ عاشق اعلیٰ بوج یہ دو مقصود رکھوں تج
عاشق ادنیٰ جوں پتنگ اعلیٰ موم بتی کا رنگ
حق کے نامہ پکڑ یقین کیوں نہ اس کوں ہوئے امیں
تحت اس تیں کیا تمام حق تھے بولیا حق کلام

"نامہ شوق" سراج اورنگ آبادی کی مشہور مثنوی ہے جس میں بہت خوبی سے صوفیانہ خیالات کی

عکاسی کی گئی ہے۔ شاعر معشوق حقیقی کے لیے اپنے جذبے کا بیان کچھ اس طرح کرتا ہے:

اے سجن، شیریں سخن جادو نین
مصر دل کا یوسف گل پیر ہن
کئی تیرے بن محرم جانی نہیں
قدر دان راز، پنهانی نہیں

خلق میں مشہور ہوں تیرا غلام
مجھ کوں تیرا جانتے ہیں خاص و عام
میر تقی میر نے مثنوی "در بیان دنیا گوید" انسانی زندگی کی بے وقعتی، بے ثباتی اور فنا پذیری کو
موضوع بنایا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

سنو! اے عزیزانِ ذی ہوش و عقل کہ اس کاروانِ گہہ سے کرنا ہے نقل
پیہر ہے شہ ہے کہ درویش ہے سبھوں کو یہی راہ در پیش ہے
کہو گے کہ آگے تھا کہتا کوئی نہیں اس سراپچ رہتا کوئی
جسے دیکھو چلنے کا گرم تلاش یہ منزل نہیں جائے بود و باش
گدا ہو کہ شاہ مال تبار یہ خاک سب کا ہے دارالقرار
خواجہ امام بخش ناسخ کی مثنوی "مشمتمل بذکر میلاد و مناقب" میں انہوں نے تصوف کا بیان کیا ہے وہ
فلسفہ وحدت الوجود کو اس طرح نظم کرتے ہیں:

وہی شش جہت میں حضور نظر
نہ دیکھے اگر ہے قصورِ نظر

نہ وہ ہے مرکب نہ وہ ہے بسیط
مگر علی کل شئ محیط

اردو کے سب سے مشہور اور مقبول مثنوی نگار میر حسن ہیں۔ "سحر البیان" ان کی بہترین شاہکار ہیں
یہی ان کی شہرت کی وجہ بھی ہے اور ان کی اس مثنوی کے پائے اور مقابلے کی مثنوی تا حال تخلیق نہیں کی جا
سکی یہی اس کی شہرت کی بہت بڑی علامت بھی ہے۔ اس مثنوی کی ابتداء بھی حمد سے ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ
نعت، متقبت اور مناجات کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ ان کے ہاں اس مثنوی میں بہت سارے اشعار خدا کی
تعریف و توصیف کرتے ہوئے وحدت الشہود اور وحدت الوجود کے فلسفے پر روشنی ڈالتے ہیں:

نہاں سب میں، اور سب میں ہے آشکار
لیے سب اس کے عالم ہیں ہر دہ ہزار

چمن میں ہے وحدت کے یکتا وہ گل
کہ مشتاق ہیں اس کے سب جزو کل

نہیں اس سے خالی غرض کوئی شے
وہ کچھ شے نہیں پر ہر ایک شے میں ہے
نہ گوہر میں ہے وہ، نہ ہے سنگ میں
لیکن چمکتا ہے ہر رنگ میں

میر حسن کے بعد اردو کے دوسرے بڑے اور معروف مثنوی نگار پنڈت دیانشر نسیم مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی نادر و یکتا مثنوی "گلزار نسیم" کی ابتداء ذات باری کی تعریف و توصیف سے کی ہے۔ حمد و ثنا تصوف کا اہم اور بنیادی نکتہ ہے اشعار بطور ثبوت ملاحظہ ہوں جن میں معشوق حقیقی کی مدح سرائی بھی ہے اور اطاعت و بندگی کا اظہار بھی:

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری	ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر	حمد حق اور مدحت پیہر
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے	یعنی کہ مطیع پنجتن ہے
ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی	کرتا ہے زباں کی پیش دستی

علامہ اقبال کی مثنوی "ساقی نامہ" اردو مثنوی کے ارتقاء میں ایک اہم موڑ اور اہم کڑی حیثیت کی حامل ہے۔ اس مثنوی میں کئی مقامات پر متصوفانہ خیالات کی عکاسی ملتی ہے۔ یہ مثنوی اقبال رفعت خیال کا عمدہ نمونہ ہے۔ ابتداء میں موسم بہار کی تصویر کشی کی گئی ہے اور بعد میں معشوق حقیقی سے بادہ معرفت کا تقاضا نظر آتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد تمام نہانی پر منکشف ہوئیں کیوں کہ یہی وہ بادہ و شراب ہے جو آدم خاکی کو عرفان الہی عطا کرتی ہے۔ مئے پردہ سوز کے طالب کی آواز ملاحظہ ہو:

پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز	کہ آتی نہیں فصل گل روز روز
وہ مے جس سے روشن ضمیر حیات	وہ مے جس سے ہے مستی کائنات
وہ مے جس میں ہے سوز و ساز ازل	وہ مے جس سے کھلتا ہے راز ازل
اٹھا سا قیا پردہ اس راز سے	لڑا دے مولے کو شہباز سے

اردو مرثیہ میں تصوف:

مرثیہ عربی زبان کے لفظ "رثاء" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی رونے اور غم کے اظہار کے ہیں۔ اردو شاعری کی اصطلاح میں مرثیہ سے مراد ہے۔ ایسی صنف سخن جس میں کسی مرنے والے کی خوبیوں اور اوصاف کو بیان کیا جائے اور اس کے مرنے پر غم اور دکھ کا اظہار کیا جائے۔ لیکن ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال زیادہ قوی ہے کہ ایسی نظم جس میں واقعہ کربلا اور اس کے دردناک واقعات جس میں بیان کئے جائے۔ اور اس میں حضرت امام حسینؑ اور ان کے رفقاء کی شہادت پر اظہار غم کیا گیا ہو۔ لیکن وقت کے بدلتے رجحانات نے مرثیہ میں شخصی مرثیے نے مقبولیت حاصل کی۔ شخصی مرثیہ سے مراد کسی مشہور سیاسی، مذہبی ہستی کی وفات پر اظہار تاسف اور اظہار غم کیا گیا ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ کارہائے نمایاں اور کارناموں کا تذکرہ بھی موثر انداز میں موجود ہو۔ مرثیے کی ہیئت کے حوالے سے کوئی باقاعدہ قانون تو نہیں ہے۔ مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ مرثیہ مربع مستزاد، ترجیع بند، ترکیب بند، مخمس، مثنوی اور غزل وغیرہ میں لکھا جا رہا ہے۔ یہ صنف خالص اردو ادب کی پیدا کردہ، طبع زاد صنف ہے۔ یہ کسی اور زبان یعنی عربی یا فارسی تقلید میں اردو ادب میں وارد نہیں ہوئی اس سب نے درجہ بدرجہ سفر عروج طے کیا اور آج اوج کمال کو حاصل کر چکی ہے۔ اردو شاعری کے مشہور مرثیہ نگاروں میں شاہ برہان الدین جانم، مرزا ہاشم علی، سودا، میر خلیق، ضمیر، انیس، دبیر اور عشق کے نام شامل ہیں۔ ان مرثیوں میں زیادہ تر نواسہ رسول اور خانوادہ رسول کی شان اور ان کے اوصاف حمیدہ کو موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ لہذا اردو مرثیہ میں کبھی براہ راست اور کبھی بلا واسطہ طور پر توصیف کے مختلف نکات کی آبیاری ہوتی ہے۔ شاہ برہان الدین جانم دکن کے مشہور صوفی بزرگ اور شاعر ہیں۔ علم تو تصوف کے موضوعات کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ:

احد وحدت میں احمد ہو ہوا ظاہر محمد ہو حسین سرور کیراجد یو اسم اعظم ہوا پیدا

مدینہ جو سرور علی باب جو رہبر سو مضی علم کا مظہر شہ اکرم ہوا پیدا

تسلیم و رضا تصوف کا ایک اہم نکتہ ہے مرزا رفیع سودا کے مرثیوں میں اس کی جھلک موجود ہے۔

خدائے سخن میر تقی میر گرچہ مرتبے میں ان کی غزل کے ہم پایہ نہیں ہیں تاہم ان کا ذکر ناگزیر

ضرور ہے ان کے ایک مرثیے میں حضرت امام حسینؑ کی ثابت قدمی اور تسلیم و رضا کو جس انداز میں موضوع

بنایا گیا ہے ملاحظہ ہو:

حیدر کا جگر پارہ، وہ فاطمہ کا پیارا
 اس چرخِ سیہ روز نے ایک فتنہ کو شکارا
 کلا تھا مدینے سے ناموس لیے سارا
 اس ظلم رسیدہ کو کن سختیوں سے مارا
 کرتا تھا وہ آنکھوں سے خونِ جگر افشانی
 دریا کے کنارے پر پایا نہ تنگ پانی
 میر مستحسن خلیق میر حسن کے مٹھلے صاحب زادے تھے ان کا شمار لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو شعراء
 میں ہوتا ہے۔ ان کا مشہور مرثیہ "عباس نے دیکھا کہ بلکتی ہے سکینہ" ہے جس میں انہوں نے پیاس کی شدت
 میں سکینہ جو ایک کم عمر بچی کو تڑپتے ہوئے دکھایا ہے اس کی تڑپ اور اضطراب کی جو عکاسی انہوں لفظوں کی
 مدد سے کی ہے وہ ان کے کمال فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

عباس نے دیکھا کہ جئے گی نہ یہ پیاری
 گودی میں لیا اور پکارے کئی باری
 پاس اس کے چلے آئے بصدِ گریہ وزاری
 عمو سے کرو بات ہے کیا شکل تمھاری
 وہ کہنے لگی شکر ہے ہر آن خدا کا
 اصغر سے زیادہ تو مرا حال نہیں ہے
 ششماہی بچہ پیاس سے مرنے کے قریں ہے
 صنفِ مرثیہ گوئی کی تاریخ میر ضمیر کے بغیر ادھوری رہے گی وہ پہلے فرد ہیں جنہوں اس صنف کی
 جانب بھرپور توجہ دی اور اس کے اجزائے ترکیبی متعین کیے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:
 خورشید تمازت پہ ہے دوپہر ڈھلی ہے
 اس دھوپ میں بے سائیہ کھڑا حق کا ولی ہے
 جو زخمِ بکسی ہوئی لالے کی کلی ہے
 لب خشک ہیں اور وردِ زباں نام علیؑ ہے
 منہ سرخ حرارت سے ہے اور غرقِ عرق
 گویا کہ ستارے سے چمکتے ہیں شفق میں
 ہے

اردو مرثیہ میں میر انیس کا نام اور مقام آفتاب و ماہتاب کی مانند جلوہ گر ہے انہوں نے اردو شاعری کو
 نابغہ روزگار و انتہائی اعلیٰ پایہ مرثیوں کی سوغات دی ہے انکی نظیر تا حال لانا مشکل ہے ان کے مرثیوں کی سب
 سے اہم خصوصیت قدرتِ زبان، شوکتِ الفاظ، اور پیکر تراشی ہے۔ اللہ کی مرضی اور رضا پر سر تسلیم خم کرنا
 تصوف کا اہم نکتہ ہے فرزندِ پیغمبرِ لختِ جگر سے رخصت ہوتے ہوئے فرماتے ہیں:

شہ بولے کہ واقف ہے مرے حال سے اللہ
 کھل جائے گا یہ راز بھی گو تم نہیں آگاہ
 یہ کہہ نہیں سکتا مجھے درپیش ہے جو راہ
 ایسا بھی کوئی ہے جسے بیٹی کی نہیں چاہ

ناچار یہ فرقت کا الم سہتا ہوں صغرا
 ہے مصلحت حق یہی جو کہتا ہوں صغرا
 وصل محبوب صوفیا کا متمتع نظر اور مقصد حیات ہوتا ہے۔ حضرت امام حسینؑ بھی جلد از جلد وصل
 خالق کے خواہاں ہیں میر انیس نے اسے یوں پیش کیا ہے:

پہنچا دے مجھے جلدی سے اے خالق افلاک
 طالب ہے ترے قرب کا سبب شہ لولاک
 اس خاک پہ جس خاک سے ملتی ہے مری
 خاک
 بے تاب ہے دل صبر کا یارا نہیں مجھ کو
 نہ ملک کی خواہش ہے نہ درکار ہے املاک
 اب فصل بجز وصل گوارہ نہیں مجھ کو

میر انیس کے بعد مرزا دبیر آردو کے دوسرے بڑے اور اہم مرثیہ گو شاعر کے طور پر جانے جاتے
 ہیں۔ ان کے مرثیہ ان کی علییت زبان دانی اور فنی مہارت کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ان کے ایک مرثیے میں صوفی کے
 اس تیقن کو بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح خالق کائنات کی رضا اور حکم کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا وہ کہتے ہیں:

کنجی در فردوس کی ہیں نام ہمارے
 اور عرش کے سکان ہیں خدام ہمارے
 دوزخ کے بھی مالک پہ ہیں احکام ہمارے
 وہ کیا ہیں خدا کرتا ہے سب کام ہمارے
 جز خالق کو نہیں ہمارا نہیں کوئی
 اور ہم سے زیادہ اسے پیارا نہیں کوئی

اردو قصیدہ میں تصوف:

قصیدہ عربی زبان کے لفظ ہے جس کے معنی مغز غلیظ کے ہیں۔ ایک اور معنی کے حساب سے قصیدہ
 "قصد" سے ہے جس کے معنی ارادہ کرنے کے ہیں۔ شعری اصطلاح میں قصیدہ ایسی مسلسل نظم ہوتی ہے جس
 کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور بقیہ اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قاضیہ ہوتے ہیں اور ہم ردیف بھی۔
 اس صنف سخن کا تعلق آردو سے ہے اس کی تشبیب میں کیفیت بہار، انقلاب روزگار، مناظر فطرت،
 پند و نصائح، تصوف، اخلاق و حکمت، بے ثباتی دنیا اور عشقیہ واردات وغیرہ کو قصیدے کا موضوع بنایا گیا ہے۔
 اردو کے مشہور قصیدہ نگاروں میں ولی، سودا، ذوق، مومن، غالب، میر، انشاد، مصحفی، قائم، چاند
 پوری اور محسن کاوردی وغیرہ کا نام آتا ہے۔

اردو شاعری میں ولی کو بنیادی طور پر غزل کا شاعر کہا جاتا ہے ان کے ہاں محض چھ (۶) قصیدے ہی دستیاب ہیں مگر ادبی نقطہ نظر سے ان کے یہ محض چھ قصیدے بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ شوکت لفظی، علوئے فکر اور نایاب و نادر تشبیہات و استعارات نے ان کے قصائد کو خوبصورتی بخشی ہے۔ ان کے موضوعات میں مذہب، تصوف، نجوم، اور موسیقی وغیرہ شامل ہیں وہ اپنے قصیدے میں رب تعالیٰ کی تعریف کچھ اس طور ادا کر رہے ہیں:

لے زبان پر تو اول اول نام پاک خدائے عزوجل
آسمان اور زمین کے ساکن یاد کرتے ہیں ہر ہر پل
شکر اس کا محیط اعظم ہے وہ ہے سلطان بارگاہِ ازل

دیگر قصیدہ نگاروں میں مراز رفیع سودا کا نام اولیت کے درجے پر روشن اور دکتا ہوا نظر آتا ہے۔ انہوں نے فن قصیدہ نگاری کو اس قدر وسعت بخشی کہ اسے فارسی قصیدے کے پائے کے برابر لاکھڑا کیا پر شکوہ الفاظ، زورِ تخیل، فصاحت و بلاغت، اور نادر و نایاب تشبیہات و استعارات انتہائی فنکارانہ استعمال نے ان کے قصائد کو حیاتِ ردام بخشی وہ ایک قصیدے میں مضمون تصوف پر اس طور اظہار خیال کرتے ہیں:

زخمی میں تیرا اور گلستان ہے برابر
کہتے ہیں جسے سروگلشن کی ہے وہ آہ
فریاد کناں بلبل و دیوار چمن میں
ہے سینہ تفسیدہ ہر اک تختہ گلزار
سوزِ دل عاشقاں جو تماشا جو ہو تجھ کو
آنسو نہ پچھے تجھ سے کبھو میرے کہ تجھ پاس
دریا میری آنکھوں سے بہتا ہے یہ لہو کا
ہر خرمن گل گنج شہیداں ہے برابر
نرگس لب جو، دیدہ گریاں ہے برابر
جو رخنہ ہے سو چاک گریباں ہے برابر
جو غنچہ ہے سو وہ دل سوزاں ہے برابر
یہ سینہ پر از داغ و چراغاں ہے برابر
لختِ دل و گلبرگِ بدایں ہے برابر
مژگاں سے مرے پنچہ مر جاں ہے برابر

مومن خان مومن اردو کے ایک اہم شاعر ان کے قصائد ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان کے یہاں الفاظ و تراکیب کا استعمال لطیف اور نازک پیرائے میں کیا گیا ہے۔ اور اسکے ہمراہ غزل کی نرنگی اور گھلاوٹ بھی شامل کی گئی ہے۔ ان کے ایک حمدیہ قصیدے کے اشعار ملاحظہ ہوں جس میں محبوب حقیقی کی تعریف و توصیف میں دلکشی اور رعنائی ملتی ہے۔

وہ نیر آسمان تقدیس جاں سوز مناظر و مرایا
 اب بھی نظر اس مجاز میں ہے کیوں مہر نگاہ میں سمایا
 نے عقل بسیط اوسکا پر تو نے نور مجرد اوسکا سمایا
 سبجانک یا الہ عالم عالم تیرا عجز نے دکھایا
 ہر جائی ہے ترا جلوہ لیکن دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا
 یاں عقل ہے گم کہ بس تجھی کو پایا ہر شے میں پر نہ پایا

مرزا غالب کی شان قصیدے میں سب سے الگ تھلگ ہے ان کا موضوع صرف نعت ہے۔ قدرتِ خیال اور طرزِ ادا کی حدت نے ان کے قصیدوں کو شادابی و راعنائی بخشی ہے۔ ایک قصیدے میں متوفانہ خیالات کا اظہار کچھ اس انداز میں کر رہے ہیں:

دہر، جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بین
 بیدلی ہائے تماشا کہ عبرت نہ ہے ذوق بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین
 لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم دردیک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

حوالہ جات

- ۱۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۲
- ۲۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۲
- ۳۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۲
- ۴۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۴
- ۵۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۴
- ۶۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۵
- ۷۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۵
- ۸۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۶
- ۹۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۶
- ۱۰۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۶
- ۱۱۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۷
- ۱۲۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۸

- ۱۳۔ مبارک شاہ، سید، "جنگل گمان کے"، بک ہوم لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳
- ۱۴۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۸
- ۱۵۔ مبارک شاہ، سید، جنگل گمان کے، بک ہوم لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۴
- ۱۶۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۹
- ۱۷۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۹
- ۱۸۔ مبارک شاہ سید، "ہم اپنی ذات کے کافر، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ص ۵۹
- ۱۹۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۴
- ۲۰۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۲۱
- ۲۱۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۲۱
- ۲۲۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء
- ۲۳۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء
- ۲۴۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء
- ۲۵۔ امجد اسلام امجد، روزنامہ ایکسپریس، گوجرانوالہ، بروز جمعرات ۱۵ جولائی ۲۰۱۵ء
- ۲۶۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

۲۷۔ سعدیہ عاشق، سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ جنگل گمان کے، غیر مطبوعہ، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

۲۸۔ زکریا انصاری، شرح الرسائلہ التثیریہ، جلد اول، مشمولہ سلمیٰ کبریٰ، مقالہ "اردو رباعی میں تصوف کی روایت ۱۹۳۶ء تک"، کلکتہ یونیورسٹی، ص ۶، سن

۲۹۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ندائتہ الخفا، مشمولہ سلمیٰ کبریٰ، مقالہ "اردو رباعی میں تصوف کی روایت ۱۹۳۶ء تک"، کلکتہ یونیورسٹی، ص ۶، سن

۳۰۔ حضرت محمد بن علی بن حسین بن ابی طالب، کشف المحجوب، مکتبہ تھانوی، دیوبند، یوپی، ص ۴۴، سن
۳۱۔ حضرت زکریا رازی، "غالب و تصوف" سید محمد مصطفیٰ صابری، ۱۹۷۷ء، ص ۴۲، مشمولہ سلمیٰ کبریٰ، مقالہ "اردو رباعی میں تصوف کی روایت ۱۹۳۶ء تک"، کلکتہ یونیورسٹی، ص ۷، سن

۳۲۔ حضرت محمد بن علی بن حسین بن ابی طالب، کشف المحجوب، مکتبہ تھانوی، دیوبند، یوپی، ص ۴۸، سن
۳۳۔ حضرت جنید بغدادی، "رسالہ کشمیریہ"، مشمولہ سلمیٰ کبریٰ، مقالہ "اردو رباعی میں تصوف کی روایت ۱۹۳۶ء تک"، کلکتہ یونیورسٹی، ص ۸، سن

۳۴۔ سید محمد مصطفیٰ صابری، غالب اور تصوف، سید محمد مصطفیٰ صابری، ۱۹۷۷ء، ص ۴۲ نیشنل آرٹ پریس آلہ آباد-۳، ۱۹۷۷ء، ص ۴۲

۳۵۔ سید محمد مصطفیٰ صابری، غالب اور تصوف، نیشنل آرٹ پریس آلہ آباد-۳، ۱۹۷۷ء، ص ۴۲
۳۶۔ حضرت محمد بن علی بن حسین بن ابی طالب، "کشف المحجوب"، مکتبہ تھانوی، دیوبند، یوپی، ص ۴۸، سن
۳۷۔ ابوالحسن نوری، "تذکرہ الاولیاء"، مشمولہ سلمیٰ کبریٰ، مقالہ "اردو رباعی میں تصوف کی روایت ۱۹۳۶ء تک"، کلکتہ یونیورسٹی، ص ۹، سن

۳۸۔ امام عبد الوہاب شعرانی، "نعتِ عظمیٰ"، مشمولہ سلمیٰ کبریٰ، مقالہ "اردو رباعی میں تصوف کی روایت ۱۹۳۶ء تک"، کلکتہ یونیورسٹی، ص ۹، سن

۳۹۔ پروفیسر نکلسن Mystic of islam, page 13، مشمولہ سلمیٰ کبریٰ، مقالہ "اردو رباعی میں تصوف کی روایت ۱۹۳۶ء تک"، کلکتہ یونیورسٹی، ص ۱۰، سن

۴۰۔ حضرت غوث اعظم، "الدرر المنظم فی مناقب غوث اعظم"، مشمولہ سلمیٰ کبریٰ، مقالہ "اردو رباعی میں تصوف کی روایت ۱۹۳۶ء تک"، کلکتہ یونیورسٹی، ص ۱۰، سن

باب دوم

سید مبارک شاہ کی غزلیات

سید مبارک شاہ کی غزل میں تصوف کا عنصر کہاں کہاں کس طور جلوہ گر ہے۔ اس بات کا جائزہ لینے سے قبل غزل اور خصوصاً اردو غزل کے ارتقاء کی منازل پر سرسری نظر دوڑاتے ہیں تاکہ اس میں لمحہ بہ لمحہ آنے والی تبدیلی اس کے رنگ و آہنگ کو بیان کرے دورِ حاضر سے اس کے تعلق اور ربط کی صورت کو دیکھا جاسکے۔

گزشتہ تین صدیاں اس بات کی گواہ ہیں کہ ایشیائی اور خصوصاً اردو شاعری میں غزل کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے اور تمام شعراء اس صنف میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ اور یہی نہیں دورِ حاضر میں بھی اس کی اہمیت کسی طور کم نہیں ہوئی، اردو شاعری تو غزل کے بغیر بے کیف اور افسردہ نظر آئے گی۔ اس صنف کی مقبولیت کا راز شاید یہ ہے کہ بلاء کی لچکدار صنف ہے۔ ہر دور کے تقاضوں سے با آسانی ہم آہنگ ہو جاتی ہے اور نئے موضوعات کو مادرِ مہربان کی طرح اپنی گود میں سمالیتی ہے اس کے موضوعات میں بلاء کا تنوع پایا جاتا ہے۔

اگر ہم غزل کے ارتقائی سفر پر نظر دوڑائیں تو ہم پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اس صنف نے بے تحاشا مشکلات، تہذیبی و تمدنی بحرانوں کا مقابلہ کر کے یہاں تک رسائی حاصل کی ہے۔ غزل کا آغاز عربی زبان کی صنفِ قصیدے سے ہوتا ہے۔ غزل دراصل قصیدے کا پہلا حصہ تشبیب ہے اور اب اسے قصیدے سے الگ کر کے غزل کی صنف سے موسوم کر دیا گیا ہے۔ اگر قصیدے کا مطالعہ بنظر غائر کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اس حصہ قصیدہ میں مضامین متنوع ہوتے ہیں اور جوش و توانائی اس حصہ سے خاص نسبت رکھتی ہے غزل کا پس منظر فارسی شاعری سے عبارت ہے اسکے بعد صنفِ قلی قطب شاہ کے ہاں دادرسی حاصل کرتی ہے۔ قلی قطب شاہ ایک صاحب دیوان شاعر تھا۔ قلی قطب شاہ سے ولی دکنی اور ولی دکنی سے میر تک پہنچتے تقریباً دو صدیوں میں اردو غزل میں بہت تبدیلی رونما ہوئی، پختگی اور رعنائی اس کا مقدر بن کر چمکنے لگی بالکل دنیا کے دوسرے ادب پاروں اور اصناف کی طرح فارسی زبان کی شاعری کے انفرادی اوصاف نے اس غزل کو بہت خوب مزین کیا اور یوں غزل ایک نئے لب و لہجے اور رنگ و آہنگ سے متصف ہوئی۔ بقول اختر انصاری:

"ہم نے ایک قدیم اور رواجی صنف سخن کو بڑی حد تک مزاج کا ترجمان بنایا اور یوں تین سو سال سے غزل ہماری شاعرانہ سرگرمیوں کا مرکز بنی رہی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہماری شاعری کے قطب نما کے لیے ستارہ قطب بنی ہوئی ہے۔" ^(۱)

عام خیال یہ ہے کہ غزل میں صرف اور صرف عشق اور معاملات عشق پر ہی بات کی جاتی ہے اور اس کے پسندیدہ موضوعات معاملات عشق اور واردات عشق ہی ہیں۔ لیکن یہ خیال سو فیصد درست نہیں اسکے برعکس اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ہم پر یہ عقدہ وا ہوتا ہے کہ غزل کا دامن بے حد وسیع ہے۔ غالب کی غزل کے بعد تو خصوصاً اس خیال کو تقویت ملی کہ غزل کا دامن مضامین کے اعتبار سے وسیع ہے۔ نئے حالات کے مطابق نئے مضامین کو جس خوبی سے اس صنف نے اجاگر کیا ہے اور اپنے دامن میں جگہ دی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس لحاظ سے اردو غزل نے اب تک کئی ارتقائی منازل طے کیے ہیں اور کئی تہذیبی مراحل سے گزری ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم ترین مرحلے قلی قطب شاہ سے ولی اور ولی سے میر اور میر سے غالب، غالب سے اقبال اور اقبال سے فیض احمد فیض تک کے ہیں یہ تمام مراحل اس لحاظ سے زیادہ قابل ذکر ہیں کہ ان میں اسلوبیاتی سطح پر کئی تجربات کیے گئے، نئے اور اچھوتے موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی اور زبان کی مختلف تحریک سے اثر لیتے ہوئے اردو غزل نے اپنے دامن کو وسعت بخشی اس صدی میں حالی اور اقبال کا نام نمایاں ترین شعراء میں نظر آتا ہے انہوں نے غزل کے مضامین میں نئے نئے موضوعات کو شامل کرنے کے ساتھ ساتھ اسے سنجیدگی اور شوخی کا موقع بنادیا اور خصوصاً اقبال نے تو غزل کی مدد اور سہارے سے ہی قوم کو خواب غفلت سے جگانے اور بیدار کرنے کا فریضہ بخوبی سرانجام دیا وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

قیام پاکستان کے بعد جلد ہی غزل کی مقبولیت اور عروج کا نیا دور شروع ہوا۔ اس دور میں جن شعراء نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق غزل کے مضامین اور غزل کی صنف کی ترقی میں اپنا اپنا حصہ ڈالا ان میں فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، عابد علی عابد، احسان دانش، حفیظ ہوشیار پوری، صوخی غلام مصطفیٰ تبسم، قتیل شفائی اور احمد ندیم قاسمی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان شعراء کا سب سے بڑا کارنامہ اردو غزل میں نئے تجربات ہیں جن میں غزل کے قدیم علامت و رموز کو نئے مفاہیم سے سجا کر پیش کیا گیا اور یہی غزل میں جدت اور تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

تقسیم ہند کا لازمی اثر اردو غزل نے بھی قبول کیا اور ہجرت و فسادات سے متعلق موضوعات نے غزل کے دامن میں جگہ حاصل کی نسل انسانی کی ہلاکت، بے تحاشا خواہشات و آرزوؤں کی موجودگی، قتل و غارت گری، شہروں کا اجڑنا، تخریب اور شکست و ریخت قافلوں کا لٹنا، عصمتوں کی پامالی، عزیزوں کا بچھڑنا، اور بے گھر ہونا یہ تمام ایسے دلخراش واقعات اور حقائق تھے جن کی وجہ سے اس دور کے شعراء کو اپنا زمانہ اور عہد، عہد میر لگتا ہے اور ان شعراء کی شاعری میں رنگ میر کا اثر بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری رقمطراز ہیں:

"یہی وہ زمانہ تھا جب میر کا اتباع ایک تحریک کی شکل میں کیا گیا۔ شعراء کے ایک گردہ نے جس کے سرخیل ناصر کاظمی تھے پہلے میر کی رات کو ایک عہد کی رات سے ملا کر اس میں لاتعداد قافلے گم کیے پھر ان کی بازیافت شروع کی۔" (۲)

۱۹۵۵ء کے بعد شاعری نے نئی فکر و نظر کے قیام کا فریضہ سرانجام دیا اور غزل کے لسانی ماحول میں بہتری اور تبدیلی آگئی۔ وقار رضوی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"۱۹۵۴ء کے بعد ایک غزل آفریں فضا پیدا ہوئی اور اس فضا میں جدیدیت نے جنم لیا۔ جدیدیت کا جوازیہ ہے کہ ترقی پسند تحریک پر نئی نسل کا اعتماد اٹھ چکا تھا اور نئی نسل کا رجحان فلسفہ وجودیت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ترقی پسند تحریک کی مخالفت ۱۹۵۷ء کے بعد بڑھ گئی اور جدیدیت نے فروغ پایا۔" (۳)

۱۹۶۰ء کا عشرہ پاکستان معاشرت میں تبدیلی کی وجہ سے بیحد اہمیت کا حامل رہا صنعتی ماحول اور شہری زندگی کی وسعت کی وجہ سے احساس زیاں در افراد معاشرہ بڑھتا گیا۔ معاشرتی نظام کے شکست و ریخت جاگیر دارانہ سماج کا ظلم و ستم اور مارشل لاء سے جنم لینے والی صورتحال نے تحفظ ذات کی ضرورت کو مزید بڑھا دیا۔ یہ صدی اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں بہت سے مغربی افکار اردو شاعری کا حصہ بنے اس سلسلے میں کچھ شعراء نے اس سے زیادہ اثر قبول کیا ان میں ظفر اقبال، کشور ناہید، شکیب جلالی، عدیم ہاشمی، جون ایلیا، ادا جعفری، فہمیدہ ریاض، امجد اسلام امجد، منیر نیازی اور عبید اللہ کا نام قابل ذکر ہے۔

۶۰ کی دہائی سیاسی لحاظ سے بڑی ہنگامہ خیز رہی کہ ایوب خان کے خلاف چلنے والی سیاسی تحریک نے صدیوں پر مشتمل معاشرتی نظام کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ اس کا لازمی اثر ادب اور شاعری پر نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ عوامی شعور کے ساتھ ساتھ عصری آگہی بھی شعری قالب میں ڈھلنے لگی۔

۷۰ کی دہائی میں اردو غزل میں نئے موضوعات اور اسلوبیاتی تجربات ہوئے اور غزل کو جدت سے ہمکنار کرنے کی سعی کی گئی۔ اس سعی کے نتیجے میں بہت سارے نئے غزل گو شعراء ظاہر ہوئے جن میں اظہار الحق، پروین شاکر، افتخار عارف، افضال احمد، بشیر سیفی، محسن نقوی، خاور اعجاز اور بہت سے دیگر کے نام شامل ہیں۔

۷۰ کی دہائی کا ایک اہم دلخراش واقعہ سقوط ڈھاکہ ہے اور اس کا اثر معاشرے کے حساس طبقہ یعنی ادباء اور شعراء کے ہاں بخوبی نظر آتا ہے۔ اس دہائی کے حالات کے پیش نظر آنے والی تبدیلیوں کی وجہ سے نئی علامات کا بھی ظہور ہوا اور بستی، پیڑ اور گھر کی علامتیں وطن کی مٹی اور خاک کی نمائندگی کے طور پر سامنے آئیں۔ بقول شاعر

دیوار کیا گری میرے کچے مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے

اس دور میں دیگر شعراء جو اہم نظر آتے ہیں ان میں اجمل نیازی اکبر عباسی، نوشی گیلانی اور ناصر زیدی اور کئی اور نام بھی شامل ہیں۔ آج ہماری اردو زبان کی صنف غزل جو ارتقاء کی مختلف منازل سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہے بجا طور پر جام وینا، گل و بلبل اور محب و محبوب کے فرضی قصوں کے بجائے حقیقی اور زندگی کے حقائق کی آئینہ دار کہلائی جاسکتی ہے۔

اردو غزل کی خوش قسمتی رہی ہے کہ اسے ہر دور میں ایسے باکمال اور نابغہ روزگار قسم کے شعراء میسر آتے رہے ہیں جنہوں نے اپنا خون جگر دے کر اس کی آبیاری کا فریضہ سرانجام دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج اکیسویں صدی میں بھی غزل نہ صرف اپنے پورے قد سے کھڑی نظر آتی ہے بلکہ دیگر اصناف کے مقابلے میں زیادہ قابل اعتبار اور ہمہ گیر صنف کی حیثیت کی حامل ہے۔

زود گو اور منفرد و ممتاز لب و لہجے اور اسلوب و فکر کے حامل شاعر سید مبارک شاہ ہماری اردو شاعری کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو گزشتہ صدی کی آخری دہائی میں ادبی افق پر جلوہ گر ہوئے۔ گزشتہ صدی میں ہونے والے واقعات جن میں قیام پاکستان، ہجرت، فسادات، سقوط ڈھاکہ، مارشل لاء اور جمہوری قدروں کی پامالی شامل ہے۔ ان واقعات و حالات کے زیر اثر تمام شعراء نے شاعری کی۔ لیکن سید مبارک شاہ کے ہاں اس سے قطع نظر موضوعات میں انفرادیت نظر آتی ہے اور ان کا اسلوب بھی باقی عام روش سے الگ تھلگ

اور ممتاز نظر آتا ہے۔ انکی شاعری خدا، انسان اور کائنات جیسے موضوعات سے مزین نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں سلطان ناصر "جنگل گمان کے" کے دیباچے میں رقمطراز ہیں:

"سید مبارک شاہ نے اردو شاعری کے موضوعات میں جس روش کی طرح ڈالی ہے وہ انہی سے مخصوص ہے اور اس روش نے انہیں معاصر شعراء سے نہ صرف ممیز بلکہ دور بھی کر دیا ہے اس طرح ان کے ہاں تصوف برائے شعر گفتن نہیں بلکہ ایک ذاتی تجربہ اور ایک واردات ہے لہذا انہیں کہی سنی باتیں دہرانے سے کچھ دلچسپی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انکا نقطہ نظر روایتی متصوفین کو ہضم نہیں ہوا۔" (۴)

سید مبارک شاہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن غزل کی دنیا میں بھی آپکا رتبہ کسی طور کم نہ تھا۔ آپکی غزل نہایت ممتاز اور منفرد آہنگ کے مالک ہے خوبصورت طرز احساس، بلند آہنگی منفرد لہجہ اور اس پر مستزاد یہ کہ فلسیفانہ افکار و خیالات کو بھی بہت خوبصورتی سے سمویا گیا ہے آپ کی غزل کا کمال یہ ہے کہ آپ نے اس میں بے حد خوبصورتی، اور مہارت سے فکر و فلسفہ کو بیان کیا ہے اور یہی نہیں قاری کو کہیں بھی ناگواریت کا احساس نہیں ہوتا اور نہ ہی کلام میں شعریت کے عنصر کو نقصان پہنچتا دکھائی دیتا ہے اور یقیناً انہیں مذکورہ بالا خصوصیات کی بناء پر آپ کے کلام میں تاثر اور دلربائی اور دلکشی کا پہلو نمایاں ہے۔ سید مبارک شاہ کی غزل کے مطالعہ کرنے پر قارئین پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ آپکی غزل حقیقت پسند جذبے کی عکاس ہے اور وہ زندگی کو حقیقت کی نظر سے دیکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں ماورائی اور خیالی موضوعات کی بجائے حقائق پر مبنی زندگی سے متعلق سچے اور حقیقی مضامین کو بیان کیا گیا ہے۔ آپ زندگی کو محض سرسری نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ زندگی کو ایک فلسفی، ایک مفکر و دانشور کی نظر سے دیکھتے ہوئے اسکے حقائق پر نظر ڈالتے ہیں اور انتہائی باریک بینی سے اس کا گہرا مشاہدہ کرتے ہوئے اسکے رازوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہد اس وجہ سے آپکو بجا طور پر اقبال کا مقلد کہا جاسکتا ہے۔ آپکی غزل کا دامن موضوعات کے تنوع کے باعث بہت وسیع دکھائی دیتا ہے۔ آپ زندگی کے تلخ اور شدید جذبات کو نہایت بے پاکی اور ہمت اور جرأت سے شعر کا جامہ پہنا کر قارئین تک پہنچاتے ہیں۔

سید مبارک شاہ اپنے کلام میں جا بجا عمیق تفکر سے کام لیتے ہوئے خدا سے مخاطب ہو کر اپنے ذہین میں اٹھنے والے سوالات کا جواب طلب کرتے ہیں۔ آپکی غزلیات میں عشق حقیقی، تصوف، خودی، عرفان ذات الہی، عرفان ذات، عبادت، اخلاص، ایمان اور زندگی جیسے موضوعات کو شامل کیا گیا ہے۔ اور ان علاوہ

بے ثباتی دنیا، انسانیات، معاشرتی بے حسی اور جستجو بھی آپ کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ جو آپ کی غزلیات میں ظہور پذیر ہیں۔ انسان کا خدا سے تعلق آپ کا ایک اہم موضوع ہے اس کو بھی نہایت خوبصورتی و عمدگی اور اچھوتے انداز سے آپ کی غزلیات میں بیان کیا گیا ہے۔

تصوف:

تصوف کی بنیاد روحانیت پر قائم ہے۔ انسان روح اور جسم سے مل کر بنا ہے لہذا روح اور جسم کی اپنی اپنی جگہ اہمیت مسلم ہے۔ روح کی پاکیزگی اور تقدس کے لیے قرآن و حدیث کی تعلیمات کا سہارا ناگزیر ہے۔ اس علم سے واقفیت ہی دراصل تصوف ہے۔ اور اس جاننے والے کو صوفی کہا جاتا ہے۔ اس علم کے سہارے ہی انسان باطنی طور پر مشاہدہ حق کا حقدار ٹھہرتا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ خود آگہی اور خدا شناسی کی منزل تک اس کی رسائی ممکن ہو سکتی ہے حیات و کائنات سر بستہ راز اسی کی مدد سے واہو سکتے ہیں۔ العرض تصوف دین اسلام کی روح اور مذہب کی حقیقت ہے۔

تصوف کی بنیاد قرآنی تعلیمات پر استوار ہے۔ یہ ایک مستقل علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بات پر شیخ الاسلام زکریا انصاری کا قول ہے:

ترجمہ: "تصوف ایک علم ہے جس سے نفوس کی پاکی، اخلاق کی صفائی اور ظاہر و باطن کی آبادی اور آرائستگی کے احوال معلوم ہوتے ہیں اور اسکا مقصد ابدی سعادت کا حصول ہے" (۵)

تصوف کے حوالے سے مختلف صو ضیائے کرام کی رائے بھی اہمیت کی حاصل ہے۔
"تصوف نیک خوئی کا نام جتنا کوئی شخص نیک خوئی میں بڑا ہوگا اتنا ہی تصوف میں بڑھ کر ہوگا۔" (۶)

"تصوف صفائی قلب، صفائی باطن و تعمیر ظاہر و باطن ہے۔" (۷)

غزل سے تصوف کا بہت گہرا رشتہ اور تعلق ہے یہی وجہ ہے کہ سید مبارک شاہ کے کلام میں بھی ہمیں تصوف کا رنگ بہت گہرا نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں مسائل کے ساتھ ساتھ فکر، احساس اور خلوص کے جلوے بھی دکھائے دیتے ہیں یوں کہنا بجا ہوگا کہ اقبال کی طرح سید مبارک شاہ کے ہاں بھی تصوف ابتداء ہی سے جلوہ گر نظر آتا ہے۔

"ان کے ہاں تصوف برائے شعر گفتن نہیں بلکہ ایک ذاتی تجربہ اور ایک واردات ہے
لہذا انہیں کبھی سنی باتیں دھرانے سے کچھ دلچسپی نہیں۔" (۸)

ویسے تو تصوف کا دامن موضوعات کے حوالے سے کافی وسیع ہے لیکن سید مبارک شاہ کے ہاں ہمیں
ان کی شاعری میں تصوف ان رنگوں میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔

۱۔ وحدت الوجود، اور تصور خدا یا عرفان ذات الہی:

وحدت الوجود کے بانی شیخ اکبر محی الدین عربی ہیں۔ اس نظریے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اس
کائنات کی ہر چیز میں خدا موجود ہے وہ ہر جگہ ہر چیز میں پایا جاتا ہے اور حقیقی وجود اللہ کا ہے باقی کائنات اور
مظاہر کائنات کا وجود غیر حقیقی ہے یعنی اللہ کل ہے اور کائنات اس کا جزو ہے یا ایک چھوٹا سا حصہ ہے اور ایک
دن اس جزو نے کل کے ساتھ مل جاتا ہے۔

"انسانی قالب میں خدا ہی مکین ہے خود خدا نے فرمایا ہے کہ اے انسانو! میں تمہاری
ذاتوں میں بستا ہوں خدا کا انسان کی ذات میں بسنا ایسا ہی ہے جس طرح خوشبو پھول
میں بستی ہے۔ رب ایک ہے ظہور صفات بہت، معنی ایک عبارت مختلف ہے" (۹)

عقیدہ وحدت الوجود کے حامی موجودات اور ممکنات کے منکر ہیں اور وہ خدا محسوس اور موجود کو ہی
مانتے ہیں۔ یہ نظریہ درحقیقت اسلامی تعلیمات سے متصادم اور متضاد ہے کیونکہ رب تعالیٰ وہ ہستی ہے جس کا
مادی طور پر محسوس کرنا اور عقل کے سہارے اس تک رسائی کا حاصل کرنا ممکنات میں سے ہیں کیونکہ انسانی
آنکھ اسے دیکھنے کی صلاحیت سے متصف نہیں اور حواس کا اندازہ "خبر" کے ذریعے کر نہیں سکتے وہ ہستی تو ہر
کہیں موجود ہے اور ہر چیز میں اسکی ذات کی گواہی ملتی ہے۔ قرآن مجید میں خود اللہ فرماتا ہے:

ترجمہ: "جس شے کا اللہ ارادہ فرماتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔"

مندرجہ بالا آیت سے "کن" کے مخاطب سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہے۔

۱۔ خدا یا تو خارج میں کسی شے سے مخاطب ہے۔ ۲۔ یا معدوم سے مخاطب ہے۔

اگر ہم اس سے مراد اول الذکر بیان لیتے ہیں اس بات کی تردید درج ذیل آیت سے ہو جاتی ہے۔ آیت ہے:

ترجمہ: "قبل از خلق تو تو کوئی شے نہ تھی (وجود خارج نہ تھا) میں نے تجھے خلق کیا۔"

سید مبارک شاہ ہمیں عقیدے وحدت الوجود کے قائل نظر آتے ہیں:

"اگر وحدت الوجود کا انکار کیا جائے تو یہ شرک ہے کیوں کہ خدا نے اگر "کن" کہا تو کس سے کہا؟ "کن" ایک لفظ ہے کہ "ہو جا" تو کس کو کہا گیا؟ اس وقت کہا کہ جب اس کے سوا کچھ موجود نہ تھا۔" (۱۰)

اس سلسلے میں سید مبارک شاہ نے اشعار میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مظاہر فطرت کی خوبصورتی اور رعنائی، شادابی اور تازگی کو اللہ کے حسن بے مثال سے ملا دیا۔

آتے ہیں جن کے در سے پیمبر صبا کے دیکھ
کھلتے ہیں شاخ شاخ پہ چہرے خدا کے دیکھ
(جنگل کمان کے، ص: ۴۲)

ایک اور جگہ اسی حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ بظاہر خدا دور ہے۔ نظر نہیں آ رہا مگر وہ تو میرے اور تمہارے اندر چھپا بیٹھا ہے۔ دوری ظاہری ہے اصل میں وہ ہمارے اندر موجود ہے وہ رقمطراز ہیں:

بڑی دوریاں ہیں لیکن
کوئی فاصلہ نہیں ہے
(جنگل کمان کے، ص: ۱۰۹)

سید مبارک شاہ کے ہاں یہ خیال بڑی شدت سے ملتا ہے کہ دراصل خدا کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ خدا خود ہم میں موجود ہے اور انسان کیونکہ اس کل کا ایک جزو ہے وہ خود بھی خدائی صفات کا حامل ہے اور صرف بصیرت چاہیے ہمیں اپنی ذات میں خدا مل جائے گا۔

یوں تو اس سے فاصلہ نہیں
بچ میں پر راستہ کوئی نہیں
ہاں مگر سینے کے اندر جھانکنا
آسمانوں پر خدا کوئی نہیں

(جنگل کمان کے، ص: ۱۰۸)

ایک اور جگہ وہ اپنی ہستی کی بے توقیری اور تذلیل اس وجہ سے گوارا نہیں کرتے کہ اس میں خالق کی شان میں بے ادبی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے اور یہ ان کی حمیت اور غیرت بندگی کے لیے ناقابل برداشت ہے وہ یوں رقمطراز ہیں:

گوارا کس طرح کرتا میں ذلت اپنی ہستی کی
سوال اس میں میرے اپنے خدا کی آبرو کا تھا

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۱۹۱)

انکے خیال میں عبد و معبود دراصل ایک ہی آئینے کے دو رخ ہیں وہ اس میں فرق محسوس نہیں کرتے
اور عالم موجودات میں خالق و مخلوق کو دراصل ایک ہی کل کے حصے سمجھتے ہیں وہ خالق کو کل اور مخلوق کو اسکا
جزو گردانتے ہوئے ایک ہی سمجھتے ہیں

معبد میں خدا ہم نے سجایا تو ہے لیکن
اس کو کبھی سینے میں بھی محسوس کیا ہے

(جنگل گمان کے، ص: ۱۴۷)

وہ میرے سوا ہے لیکن
کوئی دوسرا نہیں ہے

(جنگل گمان کے، ص: ۱۰۹)

کیسے ممکن ہے کہ دونوں روبرو بیٹھیں کبھی
تو جو مل جائے تو خود کو ڈھونڈتا رہتا ہو میں

(جنگل گمان کے، ص: ۱۳۶)

عقیدہ وحدت الوجود کے ماننے والے من و تو کے فرق کو نہیں مانتے ان کے خیال میں مخلوق دراصل
خالق کے وجود کا ہی ایک ادنیٰ سا حصہ ہے تو یہ پھر کیسے ممکن ہے کہ ایک حصہ دوسرے کے مد مقابل آئے۔
یہی بات مبارک شاہ بھی کہہ رہے ہیں: کہ دونوں ایک ہیں:

کون کہتا ہے کہ میری دسترس میں وہ نہیں
آئینے میں کس کو پہروں دیکھا رہتا ہوں میں

(جنگل گمان کے، ص: ۱۳۶)

دونوں ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر آمنے سامنے ہو ہی نہیں سکتے کیوں کہ جب میں رب کو پالیتا ہوں تو میرا وجود فنا کی چادر اوڑھ کے اس بقاء کا حصہ بن کر اسی میں ضم ہو جاتا ہے تو پھر اس کو الگ یا روبرو دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شاید یہ کمال معرفت اور عرفان ذات الہی کا وہ درجہ اور وہ منزل اور نقطہ ہے جہاں تک رسائی کسی عام آدمی کے لیے اور شریعت کی حدود میں رہ کر کسی شخص کے لیے نہ صرف کہ مشکل امر ہے بلکہ ناممکنات میں سے ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت ذات کی نفی نہیں بلکہ اثبات کی تعلیم کا پرچار کرتی ہے جبکہ ذات کو مختلف فرائض کی بجا آواری اور اطاعت و فرمانبرداری کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی جیسی نعمت ملتی ہے۔

یہ ردا ہے دوزخِ وقت بھی کہ مکان ہے میرا بہشت میں
میرے وسوسوں کو خبر نہیں کہ خدا ہے میری سرشت میں

(جنگل گمان کے، ص: ۱۱۹)

وہ میری نظر میں بس کے
مجھے دیکھتا نہیں ہے

(جنگل گمان کے، ص: ۱۱۱)

۲۔ خدا اور انسان کا تعلق عبادت خالق سے تعلق کا ذریعہ:

اگر ہم سید مبارک شاہ کی شاعری کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ حقیقت پتا چلتی ہے کہ ان کی شاعری کا مرکزی موضوع خدا اور انسان کا تعلق ہے۔ اس تعلق کے بارے میں دیگر شعراء بھی بیان کرتے رہے ہیں مگر سید مبارک شاہ نے اس رشتے اور تعلق کی تعریف اور وضاحت کسی دوسرے ہی انداز میں کی ہے یا یوں کہنا مناسب ہو گا کہ انہوں نے اس تعلق کی تعبیر اپنے الگ اور منفرد انداز میں پیش کی ہے۔ اور اس تعبیر اور وضاحت میں ایک اور بات جو شدت سے محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ہمیں شاعر کی اپنی ذاتی جذباتی نوعیت بخوبی نظر آتی ہے۔ وہ محض معاشرتی تقاضوں کی پاسداری کرتے نہیں نظر آتے۔ سید مبارک شاہ نے جس انداز اور جس چھب سے خدا اور انسان کے تعلق کو بیان کیا ہے وہ ایک ایسا تعلق ہے جو صدائے درد مند

﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ﴾

کا جواب اور دعوت

﴿يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ﴾

﴿إِلَىٰ رَبِّكَ رَاضِيَةً مُّرْضِيَةً﴾

کی قبولیت کا غماز ہے۔

اگر ہم انسانی تاریخ کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں تو ہمیں پتا چلتا ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر آخری نبی تک تمام کے تمام انبیاء کی بعثت کا مقصد اور ان کی تعلیمات کا نچوڑ صرف اور صرف انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے قریب تر کر کے قربِ الہی کا حقدار بنانا ہے۔ کیوں انسان اپنی اصل سے کٹ کے رہ ہی نہیں سکتا اور نظریہ وحدت الوجود کی رو سے جز کو کل سے ملاپ کرنا از بسکہ ضروری ہے۔ لیکن دوسری جانب یہ بھی ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ خالق اور مخلوق کے درمیان وقت کے ساتھ ساتھ بعض اداروں اور اس دوری کے نتیجے میں عرفان جاتا رہا۔ اور جدائی اور دوری مزید بڑھتی گئی۔ اس دوری کی وجہ سے خالق اور مخلوق کے تعلق میں بھی خلوص اور اخلاص کا عنصر ہوتا گیا اور کھوٹ کا عنصر غالب آتا گیا۔ ایمان کی جگہ کفر والحاد و شرک نے جگہ بنالی اور رسمی تعلق اور رسمی جملے انسانوں کی زبانوں پر جاری و ساری ہو گئے۔ سید مبارک شاہ کے ہاں اس تعلق کی موت پر ماتم نظر آتا ہے وہ ایسے جذبات اور ایسے نظریات سے نالاں اور بیزار نظر آتے ہیں خلوص سچائی اور ایمانداری کے ساتھ ساتھ وہ ایمان کی علامات اور ضامنوں میں مکمل تصدیق، توثیق اور شہود کو اہمیت دیتے نظر آتے ہیں۔ اور اگر ایمان میں خلوص نہ ہو تو رسمی ایمان ان کے ہاں قابلِ تعزیر ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

بتا ان اہل ایمان کی سزار کھی ہے کیا تو نے

خداوند! جو تجھ کو احتیاط مان لیتے ہیں

(مدارنار سائی میں، ص: ۴۰۹)

انسان جب وجود میں آیا اس روز سے ہی وہ موحد رہا ہے اس نے تمام مظاہر فطرت میں خدا کی صورت دیکھ کر یہ سمجھا کہ شاید یہی میرا خدا ہے، خالق ہے، لیکن رفتہ رفتہ اس پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ نہیں بلکہ ان مظاہر کی صورت میں خدا ہر جگہ موجود ہے یہ تمام خدا کے وجود کا احساس دلاتے ہیں اور اس کی کاریگر ی اور اس کی موجودگی کا مظہر ہیں۔ اس حقیقت کے اب آثار یاتی اور بشریاتی شواہد بھی ملنے لگے ہیں کہ انسان نے کبھی بھی تاریخ کے کسی دور میں بھی خدا کی ذات کا انکار نہیں کیا بلکہ موحد رہا ہے البتہ وہ مظاہر میں خدا کی تلاش کرتا رہا ہے۔ سید مبارک شاہ نے بھی اس حقیقت کو اپنے کلام میں بہت متاثر کن انداز میں پیش کیا ہے وہ رقمطراز ہیں:

انسان کسی بھی دور میں مشرک کبھی نہ تھا
پتھر کے نام پہ بھی تجھے پوجتا رہا

(جنگل گمان کے، ص: ۷۸)

بظاہر اور مجسم صورت میں انسان خدا کو دیکھ ہی نہیں سکتا لیکن اگر انسان نے کسی صنم کی پوجا بھی کی تو
دل میں تصور خدا کا لیے ہوئے تھا اور اس نے پتھر جو خدا کی تخلیق ہے اسے بھی خدا ہی کا درجہ دیا محض اس
لیے کہ وہ بھی تو اسی ذات کے ہاتھوں تخلیق ہوا اس کا نمائندہ ہے اس کی تخلیق ہے۔
خود کو بھی ترک کر دیا تجھ کو تیاگ کر
کافر بھی ہو کے دیکھ میں مشرک ہوا نہیں

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۱۸۹)

عبادت خالق سے تعلق کا ذریعہ:

عبادت اور بندگی اصل میں ایمان کی دلیل اور تقاضائے ایمانی ہے۔ عبادت دراصل اولین شرط ہے
بندگی اور ایمان کی اور یہ شرط، یہ دلیل اور یہ انداز دراصل رب سے تعلق کی ایک دلیل ہے، توجو فرد عبادت میں
محو ہو گا۔ وہی رب سے تعلق کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ لیکن انسانی معاشرے کی بد قسمتی کہیں یا بد نصیبی کہ عبادت کو
بھی ایمان کی طرح رسوم و رواج کا درجہ دے کر اس کو بنیادی تقاضوں سے مکدر و غلیظ کر کے اس کی روح کو یکسر ختم
کر دیا ہے۔ اور اسے رسوم و رواج کے لباس سے ملبوس کر کے ایک عبادت ایک "رسوم اور رواج" ریاضت بنا دیا
ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر یہ تبدیلی کس کے کہنے پر ہوئی یا یہ تغیر کیوں ظہور پذیر ہوا۔ دراصل یہ
کارستانی دینی یا مذہبی نہیں بلکہ معاشی اور معاشرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے میں جو مقام اور مقاصد
معبد کے تھے وہ فنا ہو گئے اور یوں انسان اپنے خالق کی حقیقت اور اس کی اہمیت اور عرفان سے دور ہو کر مجاز میں
مصروف ہو گیا، اس نے مقصدِ حیات کو فراموش کر دیا وہ بھول گیا تھا۔ سید مبارک شاہ نے اس المیے کی تصویر کشی
کچھ یوں کی ہے:

معبد میں خدا ہم نے سجایا تو ہے لیکن
اس کو کبھی سینے میں بھی محسوس کیا ہے؟

(جنگل گمان کے، ص: ۱۴۷)

ایک اور جگہ پر اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طور کرتے ہیں:
اک جس ہے زندانِ مذاہب میں بلا کا
گھٹ جائے گا دم ایسے مکانوں میں خدا کا

(جنگل گمان کے، ص: ۱۴۹)

بندے اور خدا کے تعلق کی بازگشت ہمیں کچھ یوں بھی سنائی دیتی ہے کہ اس جسمِ خاکی میں بسنا
دراصل اسی رب کی رضا کا مظہر ہے ورنہ روح کبھی بھی اس قید کو قبول نہ کرتی سید مبارک شاہ نے اسی بات کو
انسان کی زبان سے کچھ یوں ادا کیا ہے وہ رقمطراز ہیں:

اس پیکرِ خاکی سے مجھے خاک تھی نسبت
بسنا تھا مری روح نے اجڑے ہوئے گھر میں

(جنگل گمان کے، ص: ۱۴۸)

انسان بلاشبہ اللہ کی بہترین مخلوق ہے اور رب ذالجلال نے اسے بے شمار نعمتوں سے سرفراز کیا لیکن
سب سے بڑی عزت افزائی اس کی تب ہوئی جب اسے اشرف المخلوق کا درجہ دیا اور فرشتوں کے سوال پر رب
تعالیٰ نے فرمایا،

"بے شک جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے"

تو محض اتفاق نہیں تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخلوق اللہ کی پسندیدہ مخلوق ہے اسی تعلق کو سید
مبارک شاہ کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

اے عہدِ ناسپاس تو حدِ ادب میں رہ
خواہش ہوں میں خدا کی مرا احترام کر

(جنگل گمان کے، ص: ۱۵۰)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

تیری رضا سے قید ہے زندان، عمر میں
وہ جس پہ لا مکان کا آنگن بھی تنگ ہے

(جنگل گمان کے، ص: ۱۳۷)

انسان خدا سے دور ہوتا جا رہا ہے اور اس تعلق میں کمزوری کا عنصر شامل ہوتا جا رہا ہے۔ اس دوری کی وجہ معلوم نہیں ہو سکتی ہے

کہ انسانوں کے دل میں لالچ نے اپنا ڈیرا ڈال لیا ہے یا پھر اس کی خواہشات خود سر ہو کر بھٹک گئی ہیں۔ سید مبارک شاہ نے اس بات کو موضوع سخن بناتے ہوئے کہا ہے کہ دراصل ہم انسان عبادت کے روایتی طریقوں پر گامزن ہیں اور عبادت محض رسم و رواج سمجھ کر کرتے ہیں اس میں خلوص کا عنصر ناپید ہو گیا ہے۔ اور اب ہم انسان پتھروں سے بنے اصنام کی پوجا میں لگ کر اصل حقیقی معبود کو فراموش کر چکے ہیں اور یہی تعلق کی کمزوری کی نشانی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

یہ طواف کعبہ ، یہ بوسہ سنگِ سیاہ کا
یہ تلاش کس کی ہے پتھروں کے حجاب میں

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۲۳۴)

ایک اور جگہ وہ رقمطراز ہیں:

جنت کی ہوس جن کی اطاعت کا سبب ہے
ان کے لیے کم پڑتی ہے دوزخ کی سزا بھی

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۱۹۲)

سید مبارک شاہ کے کلام میں انسان اور خدا کے تعلق کے جلوئے قدم قدم پہ بکھرے نظر آتے ہیں وہ رقمطراز ہیں:

تھی ہجر کے رستے میں کہیں وصل کی منزل
ہم نے تری دوری کو بھی دیکھا ہے قریں سے

(جنگل گمان کے، ص: ۴۴)

اک حشر یہ بھی ہو گا قیامت کے دن پیا
انسان لپٹ کے روئے گا پروردگار سے

(جنگل گمان کے، ص: ۴۳)

سر جھک گیا ہے اپنی ہی رفعت کے سامنے
میں تجھ کو پوجتا ہوں خدائے بشر پرست

(جنگل گمان کے، ص: ۸۰)

شہ رگ کو چھوڑ کر میرے سینے سے لگ کبھی
دل میں قیام ساکنِ جبلِ الوریٰ کر

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۲۱۳)

سید مبارک شاہ خدا سے بات کرتے ہیں۔ گلہ شکوایے باکانہ انداز میں کرتے ہیں کیوں کہ وہ ایک
فلسفی کی سی نظر کے حامل ہیں اور وہ بندے اور خدا کے تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خالق و
مخلوق میں بڑا گہرا رشتہ ہے جتنی بے پاکی اور آزادی سے رب سے بات کی جاسکتی ہے۔ وہ کسی اور ہستی سے نہیں
ہو سکتی اس منظر اور اس بات چیت کا انداز مبارک شاہ کے ہاں کچھ اس طور جلوہ گر ہوتا ہے:

مہلت کسے نصیب کہ دیکھے بقا تیری
ثابت نہیں ثبوت بھی تیرے ثبات کا

(جنگل گمان کے، ص: ۱۴۵)

انسان سے کیا تلخ نوائی کا گلہ ہو
غصے میں بدل جاتا ہے لہجہ بھی خدا کا

(جنگل گمان کے، ص: ۱۴۹)

گہرے تعلق کی دلیل یہ بھی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو بخوبی جاننے لگتے ہیں اور پردہ نہیں رہتا۔

خدا کو آدمی سمجھا ہے تو نے
جو ایسے گڑگڑا کر مانگتا ہے
جھٹک دیتا ہوں ہاتھوں کو اٹھا کر
مجھے وہ مجھ سے بہتر جانتا ہے

(مدارِ نارسائی میں، ص: ۵۲۷، ۵۲۸)

سید مبارک شاہ نے اپنی شاعری اور کلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور صفتِ یکتائی کو بار بار بیان کیا ہے اور پوری کائنات کو بطور ثبوت پیش کرتے ہوئے عام مظاہر کائنات کا حوالہ دیا ہے کہ ہر چیز اس رب کی ذات کی یکتائی پر دلیل ہے وہ رقمطراز ہیں:

سنگ کن سے کر چپاں ہے آئینہ تنہائی کا
ریزہ ریزہ عکس بکھرا ہے تیری یکتائی کا

(جنگل گمان کے، ص: ۴۶)

انسان اور خدا کے درمیان ادب و آداب کا تعلق:

سید مبارک شاہ کے کلام میں ہمیں رب تعالیٰ سے مخاطب ہونے کے انداز میں انفرادیت نظر آتی ہے۔ اگر ہم عام انداز میں اس سوال کو اٹھاتے ہیں کہ خدا کو مخاطب کرنے کا انداز کیسا ہونا چاہیے۔ تو یقیناً ہمیں اس کے جواب دینے کی صورت میں کچھ حدود و قیود اور کچھ لسانی انداز کو مد نظر دیکھنا پڑے گا کیوں ہم جس ہستی سے مخاطب ہیں وہ کوئی عام ہستی نہیں بلکہ ہمارا مخاطب تو وقت اور حد سے ماورا ہے۔ اور ہمارے لیے بہت مشکل ہے کہ ہم محض اپنی چند سالہ انسانی تاریخ معاشرے کے آداب پر کچھ قیاس کر سکیں۔ ہاں ایک اور صورت ہو سکتی ہے کہ لامکانی سے گفتگو کرنے کے لیے کچھ اور انداز اپنایا جائے اور وہ انداز لامکانِ دل سے ہی ممکن ہے سید مبارک شاہ کے ہاں یہی انداز مخاطب نظر آتا ہے۔ جس بے باکی، وارفستگی اور شدت جذبات سے شاعری میں مخاطب ہوتے ہیں وہ انہیں کا خاصا ہے۔

سید مبارک شاہ کے کلام کے مطالعہ میں ہمیں کہیں کہیں ادب و آداب کے حوالے سے یہ گمان گزرتا ہے کہ شاعر جذباتی ہو کر احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑتے چلے جا رہے ہیں:

کب تجھ سے ٹوٹا ہے تیری ذات کا دوام
یہ بات ماورا ہے تیرے اختیار سے

اتنی شدت سے نہ کر تردید میری ذات کی
اپنے ہونے کا مجھے ورنہ یقین ہو جائے گا

(جنگل گمان کے، ص: ۱۵۱)

انسان سے کیا تلخ نوائی کا گلہ ہو
غصے میں بدل جاتا ہے لہجہ بھی خدا کا

(جنگل گمان کے، ص: ۱۴۹)

کچھ نقش ادھورے سے بھی تخلیق ہیں تیری
لرزش بھی کہیں پر ہے تیرے دستِ یزے میں

(جنگل گمان کے، ص: ۱۴۸)

اک میں ہی نہیں عرش سے اترا ہو زمیں پر
دھرتی پہ صحیفے تیرے نازل بھی ہوئے ہیں

(جنگل گمان کے، ص: ۱۳۵)

۳۔ بے ثباتی عالم:

بے ثباتی عالم ایک ایسا موضوع ہے جسے اردو شاعری میں تقریباً ہر شاعر نے اپنے اپنے انداز اور اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر بیان کیا میر، غالب، ذوق اور درد سے یہ سلسلہ سید مبارک شاہ تک پہنچتا ہے۔ بے ثباتی سے مراد ہے ایسی کیفیت کہ جب کوئی بھی مادی چیز فنا ہو جائے دنیا مادے سے بنی ہے اور اسی لیے اسے فنا ہے، بقا صرف اور صرف رب کائنات کو زیبا ہے۔ کائنات کی ہر چیز فانی ہے۔ صرف اللہ کی ذات لافانی ہے۔ وہ تھا، ہے اور رہے گا۔ خود قرآن میں اللہ فرماتا ہے:

"الحیی القیوم"

یہ ایک تلخ حقیقت ہے اور اگر انسان خود اپنی ذات پر بھی غور و فکر کرے تو جلد ہی وہ اس حقیقت تک رسائی حاصل کرے گا کہ آج جسے زندہ کہتے ہیں چند لمحے، چند مہینے یا چند سال بعد وہ زندگی ناپید ہو جائے گی وہ زندہ موت کا لباس زیب تن کر لے گا اور انسان جو آج اس دنیا میں چلتے پھرتے اور حرکت میں نظر آ رہے ہیں وہ بہت جلد ماضی کا قصہ پارینہ بن جائیں گے اور ان کی جگہ اور لوگ آجائیں گے یوں یہ سلسلہ حیات و ممات جاری و ساری رہے گا جب تک خدائے بزرگ و برتر و مالک و خالق چاہے۔ یہ زندگی عارضی ہے اور اس کو بطریق احسن گزارنے کے لیے دو گروہوں کا خیال مختلف ہے اور اصول بھی مختلف بنائے ہیں۔

اردو غزل میں اس موضوع پر طبع آزمائی کا سلسلہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے اور اس کی بنیاد میں ہمیں کچھ ایسے ناگزیر اور عمومی مسائل نظر آتے ہیں جن کا اطلاق ہر کس و ناکس پر ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا دو گروہوں میں سے ایک گروہ نے بے ثباتی حیات کے پیش نظر انسان کو زندگی بھر پورا انداز میں جینے اور اس سے لطف انداز ہونے کا درس دیا ہے کیوں کہ ہم سب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۖ﴾

"اور موت ایک اٹل حقیقت ہے اور زندگی محض ایک استعارہ"

لیکن ان تمام حقائق کے ساتھ ساتھ مثبت انداز اور رویہ اپناتے ہوئے خوش و خرم انداز میں کارزارِ حیات میں برسرِ پیکار رہنا ہی دراصل اس گروہ کی منشا اور نصیحت ہے۔ اور محض موت کے خوف سے خود پر زندگی تنگ کرنا، زندگی کے مزوں سے خود کو کنارہ کش کرنا اور ان سے لطف اندوز نہ ہونا، غمزہ اور افسردہ رہنا کفرانِ نعمت کے برابر ہے۔ بلکہ انسان کو موت کا یقین کرتے ہوئے زندگی کو بھرپور انداز میں جینے کا رویہ اپنا نہ ہی دراصل معراجِ انسانیت ہے۔ اور یہی درس سید مبارک شاہ کے کلام میں ہمیں جا بجا ملتا ہے۔ وہ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ زندگی کو زندگی کی طرح بھرپور انداز میں جیو اور اس کے تمام الطاف سے بھرپور فائدہ اٹھاؤ اور جب موقع ملے اس کی حقیقت پر اور بے ثباتی پر غور و فکر بھی کرو۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ ابھی موجودہ لمحات سے نشاط اٹھاؤ:

کس کو فرست دیکھنے کی ہے ابھی
بجھ گئیں آنکھیں تو دیکھا جائے گا

(جنگل گمان کے، ص: ۵۸)

پھر وہ یہ بھی کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ انسان پیدا ہی جانے کے لیے ہوا۔ یہ بنا ہی مٹنے کے لیے ہے اور صرف میں، تم اور وہ نہیں بلکہ ہم تم سے پہلے بہت سے لوگ جو گہرِ نایاب تھے۔ جو انتہائی زیرک، عالم فاضل اور خوبیوں کا مرقع تھے بلکہ کامل انسان تھے وہ سب اسی سفر پر روانہ ہو چکے ہیں اسی بے ثباتی کی راہ کے راہی بن چکے ہیں تو پھر ہم تم کیوں افسردہ ہوں اور موجودہ لمحات کو سوگ کی صورت میں گزاریں وہ یوں رقمطراز ہیں:

ہاں رفتگاں کا ذکر کیا آئند گاں گئے
اک لمحے کی تلاش میں تینوں جہاں گئے

(جنگل گمان کے، ص: ۵۸)

اور وہ ان لوگوں کی زبان میں کہتے ہیں جو اس زندگی کو محض گزار آئے اور انہوں نے نہ تو اس
مخصوص وقت سے کوئی تعمیری مقاصد پورے کیے اور نہ ہی خود کی تسلی اور تشفی کا سامان حاصل کیا وہ کہتے ہیں
کہ ایسے لوگ یہ کہتے بخوبی سنے جاسکتے ہیں کہ وہ کیا کہتے ہیں

اک عمر گزار آئے تو محسوس ہوا ہے
اس طرح تو جینے کا ارادہ ہی نہیں تھا

کچھ وہ لوگ جو اس کارزارِ حیات میں رہے اور مشکل سے زندگی کا ساتھ دیتے رہے مگر آخر میں وہ کچھ
ان نتائج پر پہنچے:

موت سے گہرا دکھ بھی سہنا ہوتا ہے
کتنا مشکل زندہ رہنا ہوتا ہے

(جنگل گمان کے، ص: ۶۳)

یہ پل پل مرتے رہنا کب روا ہے
مگر پھر سوچتے ہیں زندگی ہے

(جنگل گمان کے، ص: ۶۴)

وہ موت کو اور موت کے بعد آنے والی زندگی کو انسان کے سفر کا نقطہ آغاز بتاتے ہوئے اس کی
حقیقت کے بارے میں رقمطراز ہیں:

مسافر ہو تو اتنا یاد رکھنا بس دم رخصت
یہ رستے لوٹ جائیں گے تو آغازِ سفر ہوگا

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۲۳۱)

ہماری بے ثباتی ہر قدم پر ثبتِ صحرا ہے
ہمارے زیرِ پا نہ کوئی نقش پا ہو گا

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۲۳۲)

محمود اسلم رقمطراز ہیں:

"اس کی شاعری کو پڑھیں تو یہ لگتا ہے کہ وہ دوسرے جہاں سے کسی بلاوے کا منتظر ہی نہیں خواہش مند بھی ہے جیسے اسے معلوم ہو کہ وہ کسی اعلیٰ مقام پر فائز ہونے جا رہے ہیں اور اس کے سامنے دنیا کی رونقیں ماند پڑ جاتی ہیں۔" (۱۲)

وہ اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے دلی خواہشات اور تمناؤں سے دوری اختیار کرتے ہوئے ان سے دامن بچاتے ہوئے آسانی اور سادگی کا راستہ اپناتے ہیں۔ وہ اس زندگی کی مشکلات اور کرب ناک کو اس طرح پکارتے ہیں۔

کیسے شدید کرب کے لمحے طویل تھے
ہے اختصارِ عمر کا قصہ بڑا دراز

(جنگل گمان کے، ص: ۵۱)

برباد ہوئے کتنے مگر سطحِ زمیں پر
آباد ہوئے شہر بہت خاک کے نیچے

(جنگل گمان کے، ص: ۵۲)

وہ کہتے ہیں کہ یہ نظر آنے والی زمین جس پر ہم بہت سارے جہاں آباد دیکھتے ہیں اور آسمان اس کے اوپر سائیہ فلک ہے مگر بہت سارے آسمان اور گنج ہائے گراں مایہ اس کے نیچے بھی دفن ہیں:

مانا کہ زمیں رہتی ہے افلاک کے نیچے
افلاک بھی پھیلے ہیں اسی خاک کے نیچے

(جنگل گمان کے، ص: ۵۷)

محمود اسلم رقمطراز ہیں:

"مبارک شاہ عمر اور زندگی کے فرق کو بخوبی جانتے تھے اور بسا اوقات ان کی شاعری سے یہ حقیقت آشکار ہوتی تھی گویا ان کے پاس وقت کم ہے۔" (۱۳)

وہ کہتے ہیں کہ یہ حیات بے ثبات گویا دھوکا ہے، سراب ہے:

اس عمر ناسپاس یہ دھوکا حیات کا
جیسے گمانِ فتح شکستِ مبین پر

(جنگل گمان کے، ص: ۱۲۹)

آنکھوں میں خواب رکھے ترے آسمان کے
سونے لگا ہوں دیکھ میں دھرتی میں دھرتی کو تان کے

(جنگل گمان کے، ص: ۴۹)

غرض یہ کہ وہ اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں کہ اب جانے کا ہی وقت ہے اور بے ثباتی ایک اٹل
حقیقت ہے اور جوانی کا اور زندگی کا سورج ڈھلنے کے اور غروب ہونے کے سوائے اور کو چارہ نہیں یونہی یہ
کائنات بھی ایک دن ختم ہو جائے گی۔

دو پہر تو ہے جواں سورج مگر مری طرح
ہو گئی جب رات تو زیر زمیں ہو جائے گا

تمہیں مار ڈالا تھا جن کے طرز حیات نے
انہیں جا کے شہرِ قبور میں بھی تو دیکھتے

(ہم ذات کے کافر، ص: ۲۵۳)

ہمیں اس بے ثباتی کے تصور کی اذیت بھی
تمہاری جاودانی کے سبب محسوس ہوتی ہے

(ہم ذات کے کافر، ص: ۵۲)

سید مبارک شاہ انسانی بدن کو خاک کا مکان کہتے ہوئے اس کی بے ثباتی اور اس کی کم مائیگی کا ذکر کرتے
ہیں اور ساتھ ہی روح کے لیے کہتے ہیں کہ وہ اس خاکی بدن میں مقید ہے گویا جیسے مرنے کے بعد خاکی بدن قبر
میں مدفون و مقید ہو جاتا ہے بعینہ روح کے لیے خاکی بدن بھی ایک قبر یا لحد ہے اور یوں یہ دونوں بے ثبات
ہیں۔

بدن بھی خاک کا مکان لحد بھی خاک کا مکان
مقام کوئی مستقل قیام کا نہیں رہا

(مدارِ نارسائی میں، ص: ۳۸۴)

ایک اور جگہ وہ رقمطراز ہیں:

ثبات ثابت نہیں ہوا تو فنا کی تردید کس بنا پر
الہ کا سارا ثبوت لا ہے تو ورد کیسے ہو لا الہ کا

(مدارِ نارسائی میں، ص: ۴۰۷)

موت تو از خود ہے جز و زندگی
بے ثباتی کا سبب کچھ اور ہے

(مدارِ نارسائی میں، ص: ۴۵۴)

۴۔ حساسیت:

عصرِ جدید دراصل بے حسی اور نفسا نفسی کا دور ہے اور زمانہ ہے اور ان حالات سے تمام انسان نالاں ہیں تمام معاشرتی اقدار ایک ایک کر کے دم توڑ رہی ہیں اور ایک بے حسی کی فضا نے معاشرے کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ اس معاشرے میں جھوٹ، ظلم و جبر، فریب، دھوکہ اور مکاری قابلیت کی نشانی سمجھی جانے لگی ہے اور یہ خرابیاں معاشرے کا عام مزاج بن گئی ہیں۔ شاعر جو معاشرے کا ایک حساس فرد ہوتا ہے۔ وہ ان سے ضرور متاثر ہوتا ہے یہ رویے اسے بھی متاثر کرتے ہیں سید مبارک شاہ بھی بعینہ ان رویوں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ بھی معاشرے کی اس فضا میں سانس لینے پر مجبور ہیں لیکن وہ ایک حساس فرد ہیں وہ گلہ و شکوہ اپنے کلام کے ذریعے کرنے سے نہیں رک سکتے اس لیے وہ یوں رقمطراز ہیں:

دل سے خیال دہشتِ رہزن تو جا چکا
لیکن ملالِ سازش رہبر نہیں گیا

(جنگلِ کمان کے، ص: ۷۴)

تجدید کر رہی ہیں قدامت کی جدتیں
ہر انقلابِ نو ہے مجددِ جمود کا

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۱۹۰)

دنیا کی لوٹ مار نے دنیا اجاڑ دی
پل بھر کو آنکھ کیا لگی پروردگار کی

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۲۲۸)

سید مبارک شاہ شاعر تھے مگر وہ اس معاشرے کا ایک فرد بھی تھے اس لیے انہیں اس معاشرے میں کاروبار حیات کرنا تھا۔ اسی معاشرے میں جیے جانا تھا اور زندگی کرنی تھی۔ بلکہ وہ اس معاشرے میں انتہائی اہم اور قابل ذکر جگہوں پر فائز بھی رہے جہاں انہوں نے اپنی خدمات بطریق احسن سرانجام دیں۔ لیکن ان تمام اہم عہدوں پر رہتے ہوئے بھی اپنے اندر کے حساس شاعر کو کھونے نہیں دیا بلکہ اس دوران وہ جن راہوں سے گزرے اور جہاں جہاں کی مسافرت کی ان راستوں کے احوال اور چشم دید واقعات کو شعری قالب میں ڈھالتے گئے۔ انہوں نے اپنی اس پیشہ ورانہ زندگی کے تجربات کو بھی شعر کی زباں میں لوگوں تک پہنچایا وہ بسا اوقات برملا اس عہد کا اظہار کرتے ہیں کہ نہ تو وہ ہار مانیں گے اور نہ ہی حسین اور امید افزاء خواب دیکھنا بند کریں گے اور نہ ہی معاشرے کی قبیح حقائق سے چشم پوشی کریں گے۔ ایسے فیصلے بڑے دردناک اور اذیت لیے ہوئے ہوتے ہیں اور اس اذیت کو صرف وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو ایسے ہی خیالات کے مالک ہوں۔ وہ یوں رقمطراز ہیں:

سانس سانس مرنے سے گر کبھی فراغت ہو
مسکرا کے مرضی سے ایک بار مر جانا

(جنگل کمان کے، ص: ۱۴۱)

سید مبارک شاہ افراد معاشرہ سے گلہ کرتے نظر آتے ہیں اور گلہ بھی کس چیز کا؟ وہ افراد معاشرہ کی خود شناسی سے ناواقفیت اور بے خبری پر سخت شکوہ کناں اور نالاں نظر آتے ہیں۔ انہیں افسوس ہے افراد معاشرہ کے اُن رویوں پر جن کی بناء پر آج معاشرہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا ہے۔ وہ طبقاتی کشمکش اور مذہبی فرقہ واریت کو اس تخریب ضد توڑ پھوڑ اور انتشار کی وجہ قرار دیتے ہیں۔ اور کی اس تقسیم پر افسردہ اور نالاں نظر آتے ہیں۔ انہیں یہ بات افسردہ کر دیتی ہے کہ کجا کہ ہم انسان کا خدا سے تعلق چاہتے ہیں اور یہاں تو انسان کا انسان سے ہی تعلق کمزور ہوتا جا رہا ہے اور انسان آج طبقات اور مختلف مذہبی فرقوں اور گروہوں میں بٹ کر

رہ گیا ہے اور اسی تقسیم اور انتشار نے اسے کمزور بنا دیا ہے اور آج اسی لیے انسانیت پریشاں ہے اور تباہی کی جانب رواں دواں ہے۔ انسان نے مذہب کے نام پر ایک ہلاکت خیز جنگ کا آغاز کر دیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

تہذیب و نسل و مذہب و رنگ و وطن کو دیکھ
خلق خدا کی کتنے خداؤں سے جنگ ہے

(جنگل کمان کے، ص: ۱۳۷)

کچھ اس کے رویے میں تغیر تو نہیں تھا
مجھ کو میری امید نے مایوس کیا ہے

(جنگل کمان کے، ص: ۱۳۷)

وہ کہتے ہیں کہ ہمیں محض دل میں خدا کو نہیں سجانا بلکہ اس کی ذات کو موجود محسوس کر کے ہر وہ کام کرنا ہے جس سے وہ راضی ہو اور خدا انسانیت کے انتشار اور زمین پر فساد پھیلانے سے کیوں کر راضی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے وہ بنی آدم کو خدا کو پہچاننے کے لیے کہہ رہے ہیں کہ ایسے محسوس کرو جیسا کہ محسوس کرنے کا حق ہے، وہ یوں رقمطراز ہیں:

معبد میں ہم نے سجایا تو ہے لیکن
اس کو کبھی سینے میں بھی محسوس کیا ہے

(جنگل کمان کے، ص: ۱۳۷)

وہ وسیع المشربی کا درس دیئے ہوئے انسانیت کے احترام کا پرچار کرتے ہیں اور وہ صرف اسی ایک خدائے واحد کو مانتے ہوئے تمام مسالک سے کنارہ کشی اور انسانیت کے مذہب کو اپنانے کا درس دیتے ہوئے وہ یوں رقمطراز ہیں۔

آزاد کر خدا کو خداؤں کی قید سے
سارے بتاؤں مسلکِ نفرت تباہ کر

(جنگل کمان کے، ص: ۱۵۴)

مصرف جو اک دور میں ماتم میں ہیں میرے
وہ ہاتھ میرے قتل میں شامل بھی ہوئے ہیں

(جنگل کمان کے، ص: ۱۳۵)

اسی طرح ہمارا شاعر جو دیدہ بینا کا حامل ہے وہ معاشرے میں موجود کچیوں کو ماننے اور اپنانے سے معذور نظر آتا ہے اسی لیے وہ یوں رقمطراز ہیں:

سینے سے اٹھ رہا ہے تعفن عجیب سا
میں دفن بھی نہ کر سکا میت ضمیر کی

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۲۱۵)

نہ جانے بے حسی کیا چیز ہوگی
کہ جب احساس پتھر ہو گیا ہے

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۲۹۴)

مرے شہر بدن کی ہر گلی میں
مرا اپنا لہو پھیلا ہوا ہے

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۲۹۷)

ہو خداؤں کا تسلط جس جگہ
اس علاقے میں خدا ہوتا نہیں

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۳۱۷)

دنیا کی لوٹ مار نے دنیا اجاڑ دی
پل بھر کو آنکھ کیا لگی پروردگار کی

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۲۲۸)

معاشرتی اقدار کے زوال اور انسانی حقوق کی بے قدری کے حوالے سے سید مبارک شاہ نے قلم اٹھایا

اور اسے بخوبی معاشرے کی آواز بنا کر پیش کیا۔ اس سلسلے میں سلطان ناصر یوں رقمطراز ہیں:

"سید مبارک شاہ کا معاشرتی ظلم و جبر اور انسانی حقوق کی پامالی سے رنجیدہ ہونا بھی جا بجا
کلام میں نظر آتا ہے ظاہر ہے کہ کوئی حساس انسان انسانیت کی تذلیل پر برہم ہوئے
بغیر نہیں وہ سکتا۔" (۱۱)

بے خوف ہو کے فرد کی تذلیل کیجیے
اتنے شدید جرم کی کوئی سزا نہیں

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۱۸۹)

مجھ کو مارا ہے اگر تو عدل کی تصلیب نے
وار تو میں سہہ گیا تھا ظلم کی تلوار کا

(جنگل گمان کے، ص: ۵۰)

آدم کی کسی روپ میں تحقیر نہ کرنا
پھرتا ہے زمانے میں خدا بھیس بدل کر

(جنگل گمان کے، ص: ۴۷)

غزل صدیوں کے نشیب فراز کا سفر طے کرتے ہوئے عوام کے جذبات اور حالات کی ترجمانی کرتی
نظر آتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صنف میں عوام کے جذبات، احساسات اور مسائل کو موضوع بحث بنا
کر بخوبی بیان کیا گیا ہے۔ غزل کے موضوعات میں معاشی مسائل اور اسی نوعیت کے دیگر مسائل بیان ہوتے
رہے ہیں سید مبارک شاہ کے ہاں بھی ہمیں اس قسم کے موضوعات پر شاعری نظر آتی ہے۔

ہم نے بڑے فریب میں کاٹی ہے زندگی
مقصد تمام عمر کا فکر معاش تھا

(جنگل گمان کے، ص: ۷۳)

آج کے زمانے میں معاشرے میں انسان خود کو مہذب تو کہلاتا ہے مگر اس کی تہذیب کی چادر تب
سرک جاتی ہے جب وہ نا انصافی ظلم اور جبر کا ارتکاب کھلے عام کرتا نظر آتا ہے۔ یہیں پر اس کا پردہ فاش
ہو جاتا ہے اسی موضوع کو مبارک شاہ نے بڑی خوبصورتی سے اپنے کلام میں اپنایا اور بیان کیا ہے:

بڑا خوں بہا ہے لیکن
کوئی خوں بہا نہیں ہے

(جنگل گمان کے، ص: ۱۱۰)

اگر عدل کرتیں عدالتیں، تو نہ ٹوٹیں یہ قیامتیں
اگر ان کا ہوتا محاسبہ، کہ جو محتسب کے حساب تھے

(جنگل گمان کے، ص: ۱۳۷)

بے حس ہوں کہ احساس سلامت ہے ابھی تک
پتھر ہوں جو اس دور میں پتھر نہ ہوا میں

(جنگل گمان کے، ص: ۱۳۱)

سید مبارک شاہ جیسی حساس طبیعت کے مالک فرد کا معاشرتی ظلم، جبر و استبداد اور نا انصافی اور انسانی حقوق کی پامالی جیسی باتوں سے متاثر ہونا قدرتی امر ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صرف یہ کہ انہوں نے ان کیفیات کو محسوس کیا بلکہ اسے معاشرے کے سامنے لائے بھی اور بہ بانگِ دہل انہیں غلط کہا اور ان کی اصلاح کی ترغیب بھی دی اور یہ ایک فطری امر ہے کہ ایک حساس فرد معاشرے کیسے ان حالات سے متاثر نہ ہو اور برہم ہوئے بغیر رہے۔ ان کے کلام میں غیر مسادیانہ، متعصب سماج کے خلاف نعرہ حق بلند کیا گیا ہے اور معاشرے کی بے حسی کو موضوعِ سخن بنایا ہے اور یوں رقمطراز ہیں:

بے خوف ہو کے فرد کی تذلیل کیجیے
اتنے شدید جرم کی کوئی سزا نہیں

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۱۸۹)

یہ معاشرے گو کہ ظلم کا انداز گرم کیے ہوئے ہے افراد معاشرہ بے خوف ہو کر نا انصافی اور ظلم کا ارتکاب کرتے نظر آتے ہیں۔ لاقانونیت، جبر، زیادتی اور حقوق کی پامالی بنیادی اقدار کا زوال یہ سب معاشرے میں سرگرم ہیں مگر ہر اچھے اور برے انسان نے ایک ساتھ اس معاشرے میں سرگرم سفر حیات رہنا ہے یہی حال سید مبارک شاہ کا ہے وہ اپنی تمام تر حساسیت سمیت اسی معاشرے کا حصہ ہیں اور اپنے فرائض بجالاتے ہیں مگر ان تمام کے باوجود انہوں نے اپنے اندر کے حساس شاعر کو فنا کے حوالے نہیں کیا بلکہ اس دوران انہیں جن واردات اور کیفیات سے گزرنا پڑا انہیں انتہائی خوبصورت انداز سے شعری قالب میں ڈھال کر بے نظیر و بے مثال کلام کی صورت میں انہیں دوام بخش دیا وہ یوں رقمطراز ہیں:

ہر دن تھوڑا تھوڑا کر کے مرنے کا تکلف کیا
یہ کام اک روز بہتر ہے کہ سارا کر لیا جائے

(مدارِ نارسائی میں، ص: ۴۳۰)

سید مبارک شاہ جو ایک حساس فرد معاشرہ ہے ایک شاعر خوش گمان ہے جو اپنے من کی دنیا میں ایک جنت سجائے اس کی رونقوں سے لطف اندوز نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت میں انہیں اس جہانِ آب و گل جہنم نما جہانِ زشت کا سامنا ہے۔ لیکن وہ اپنے کلام کے ذریعے بغاوت کا علم بند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ حسین خوابوں سے دستبردار ہونے کو تیار ہی نہیں اور نہ ہی وہ معاشرے کی فبیج صورت سے منکر نظر آتے ہیں۔ ان کے قلبی کیفیات صرف وہی فرد جان سکتا ہے جو خود بھی اسی قسم کے تجربے سے گزرا ہو۔ یہ "دست بکار و دل بیار" کی ایک نہایت تلخ کیفیت ہے۔

لمحے جان کنی کے زندگی پر کیسے بنتے ہیں
تو آؤ مرگ دوران میں ابھی کچھ دیر جیتے ہیں

(مدارِ نارسائی میں، ص: ۳۹۸)

۵۔ منصور حلاج سے اثر:

شاعر معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے۔ وہ میرنی حالات، شخصیات اور واقعات سے ضرور اثر لیتا ہے۔ بعلیہ سید مبارک شاہ نے بھی منصور حلاج کی شخصیت سے اثر لیا ہے۔ حسین بن منصور حلاج سے وہ اس قدر زیادہ متاثر نظر آتے ہیں کہ قرآن کے بعد اگر ان کی شاعری کی تحریک کی کوئی وجہ نظر آتی ہے تو وہ منصور حلاج کی شخصیت ہے۔ وہ ان کی شاعری کا اہم ترین ستون ہے۔ ویسے مطالعہ کیا جائے تو سید مبارک شاہ کے ہاں تاریخ کی دیگر ہستیوں کا ذکر بھی ملتا ہے جن میں گوتم بدھ، سقراط، امام حسینؑ شامل ہے۔ وہ صرف ایسے ہی کرداروں سے متاثر نہیں جن کے چہرے تاریخ کی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں۔ بلکہ وہ ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ کے تحت آتی صدائے کن فیکون کے قائل ہیں اور دور حاضر کی انسانی عظمتوں کے امکان اور وجود کو جانتے اور مانتے ہیں۔ وہ اپنے دور کی عظمتوں کے قائل ہیں اور اپنے دور کے حق گو لوگوں کو اپنے دور کا حسین کہتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے دور کے با اصول لوگوں کا ذکر اپنے کلام میں کرتے ہوئے انہیں بارہا خارج تحسین پیش کیا ہے۔

زمانہ سنگ برساتا رہا ہے اس کے چہرے پر
درونِ آئینہ جس نے خدا کی شکل دیکھی ہے

(ہم ذات کے کافر ص: ۲۲۳)

سید مبارک شاہ بھی منصور حلاج کی طرح وحدت الوجود کے قائل نظر آتے ہیں اسی لیے ان کے ہاں
بھی خدا کے تصور کا بیان منصور حلاج کے تصور سے ملتا جلتا ہے۔

کون سی زمین تیرے وجود سے خالی ہے
کہ وہ تجھے آسمانوں پہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں

ہاں مگر سینوں کے اندر جھانکنا
آسمانوں پر خدا کوئی نہیں

(جنگل گمان کے ص: ۱۰۸)

ڈھونڈتا پھرتا ہے دھرتی پر کہیں
آسمانوں کا خدا اپنی جگہ

(جنگل گمان کے ص: ۱۱۵)

آدمی کی کسی روپ میں تحقیر نہ کرنا
پھرتا ہے زمانے میں خدا بھیس بدل کر

(جنگل گمان کے، ص: ۴۷)

اے میری جسارت کا قدم ماپنے والے
معلوم مجھے رقبہ اقلیم ادب ہے

انسان کامل کی تلاش تو تقریباً ہر بڑے شاعر کے ہاں ملتی ہے رومی کے ہاں یہ "النسانم آرزو ہست"
کے نعرے کی صورت میں ہے تو اقبال کے ہاں "مردِ مومن" اور اسی طرح نطشے کا سپر مین "اسی سلسلے کی کڑی
ہے۔ سید مبارک شاہ کے ہاں اس تصور کو اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ اختر انصاری، "غزل کی تعلیم"، ترقی اردو بورڈ لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۳۹
- ۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، "اردو شاعری کا فنی ارتقاء"، الو قار پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۵۸
- ۳۔ وقار احمد رضوی، "تاریخ جدید اردو غزل"، اسلام آباد بک فاؤنڈیشن، طبع اول ۱۹۸۸ء، ص: ۸۷
- ۴۔ سلطان ناصر، مضمون "تیسرے جہاں کی تلاش"، "کلیات سید مبارک شاہ"، سیالکوٹ، ۲۰۱۲ء، ص ۱۱
- ۵۔ زکریا انصاری، "شرح الرسالۃ التفسیریہ"، مضمونہ سلمیٰ کبریٰ، مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی "اردو رباعی میں تصوف کی روایت ۱۹۳۶ء تک"، کلکتہ یونیورسٹی، ص ۶، س ن
- ۶۔ حضرت محمد بن علی بن حسین بن ابی طالب، "کشف المحجوب"، مضمونہ سلمیٰ کبریٰ، مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی "اردو رباعی میں تصوف کی روایت ۱۹۳۶ء تک"، کلکتہ یونیورسٹی، ص: ۷، س ن
- ۷۔ حضرت امام قشیری، "غالب اور تصوف"، مضمونہ سلمیٰ کبریٰ، مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی "اردو رباعی میں تصوف کی روایت ۱۹۳۶ء تک"، کلکتہ یونیورسٹی، ص: ۷، س ن
- ۸۔ مبارک شاہ سید، "جنگل گمان کے"، بک ہوم لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۴
- ۹۔ نفیس اقبال، ڈاکٹر، "اردو شاعری میں تصوف"، مضمونہ سعدیہ عاشق، مقالہ برائے ایم۔ اے، "سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ"، نمل یونیورسٹی، اسلا آباد، ص ۳۶
- ۱۰۔ سید مبارک شاہ سے، سعدیہ عاشق کا انٹرویو، ۱۳ مئی ۲۰۱۵ء، بروز بدھ بمقام راولپنڈی
- ۱۱۔ مبارک شاہ سید، "جنگل گمان کے"، بک ہوم لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳
- ۱۲۔ محمود اسلم اللہ سے، سعدیہ عاشق کا انٹرویو، ۵ دسمبر ۲۰۱۵ء، بمقام ٹی ہاؤس لاہور
- ۱۳۔ مبارک شاہ سید، "جنگل گمان کے"، بک ہوم لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۰۱۳

باب سوم

نظم اور نگاری کی روایت

اردو ادب کی دو اصناف ہیں اردو نثر اور اردو نظم۔ یعنی اردو شاعری کی کئی قسمیں ہیں جن میں نظم، غزل، مثنوی، قصیدہ رباعی، مرثیہ، مخمس، مسدس، مثنیٰ، قطعہ اور نعت وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب میں سب زیادہ مشہور صنف غزل ہے جسے ہر خاص و عام نے قبول کیا اور سراہا مگر اردو شاعری کی سب سے وسیع قسم اردو نظم ہے۔ اردو نظم میں بہت زیادہ تجربے کیے گئے ہیں اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ایک وسیع صنف ہے۔ نظیر اکبر آبادی، الطاف حسین حالی، اکبر آلہ آبادی اور اقبال، جوش ملیح آبادی، ساحر لدھیانوی، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، ن۔ م راشد اسماعیل میرٹھی، اور نظم طباطبائی نظم کے بڑے اور معروف شعراء میں سے شمار ہوتے ہیں۔

اردو میں نظم کی صنف انیسویں صدی کی آخری دہائیوں کے دوران میں انگریزی ادب سے متاثر ہو کر وجود میں آئی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مضبوطی سے قدم جما نے لگی۔ نظم بحر و قافیہ کی پابندی لیے بھی ہوتی ہے اور اس کے بغیر بھی آزاد نظم کی صورت میں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی موجود ہے۔ نثری نظم میں میراں جی، ن۔ م راشد، احمد ہمیش اور جواز جعفری کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر وحید احمد بھی نمایاں ہیں۔ موجودہ زمانے میں بھی نثری نظم کے شعراء موجود ہیں جن میں ایک اہم نام منصف ہاشمی کا ہے۔

نظم کا مادہ "ضبط" سے مشتق ہے جس کے معنی الفاظ کو مقید، یا پابند کرنا ہیں۔ اس صنف میں ایک خاص ترتیب سے الفاظ کی بندش کی جاتی ہے۔ جیسے کسی مرصع ساز کو نگوں کے انتخاب اور ان کے جڑنے میں عرق ریزی اور مشاقی سے کام لینا پڑتا ہے بعینہ لفظوں کی بندش اور انتخاب کسی بھی شاعر کے لیے بڑا اہم منصب اور کام ہوتا ہے۔ آتش نے اسی حقیقت کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں

شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اگر ہم دنیا کے ادب کا مشاہدہ کریں اور جائزہ لیں تو ہمیں یہ حقیقت پتا چلتی ہے کہ تخلیق ادب میں اول نمبر پر نظم آتی ہے اور اس کے بعد نثر کی باری آتی ہیں ماسوائے غزل شاعری کی تمام اصناف کو نظم کہا جاتا

ہے غزل اور نظم کا بنیادی فرق یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر ایک مکمل مضمون کا حامل ہوتا ہے جبکہ اس کے برعکس پوری نظم میں صرف ایک ہی مضمون کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ اس کی تعریف میں ہم کہہ سکتے ہیں "لفظوں کا وہ مجموعہ جس میں موزونیت کی صفت پائی جائے مصرع کہلاتی ہے۔ مصرعوں کا مجموعہ جن میں فکری تسلسل یا معنوی ربط پایا جائے نظم کہلائے گا۔" (۱)

اگر بغور دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ نظم میں ایک ہی موضوع اور ایک ہی خیال آخر تک چلا جا رہا ہوتا ہے۔ ابوالاعجاز صدیقی نے نظم کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے وہ یوں رقمطراز ہیں:

"نظم کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا رہا ہے کبھی غزل کو الگ کر کے باقی اصناف کو غزل کہہ دیتے ہیں۔ لیکن جب نظم کا لفظ شاعری کی ایک خاص صنف کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب اشعار کا ایسا مجموعہ جس میں ایک مرکزی خیال ہو اس کے لیے کسی موضوع کی قید نہیں اور نہ ہی اس کی ہیئت معین ہے ایسی نظموں کو اردو کی قدیم اصناف سے الگ ہی رکھا جاتا ہے۔ جن کی علیحدہ حیثیت اور تاریخ جیسے مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، رباعی، --- نظم کا لفظ شاعری کی ایک مخصوص صنف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اسے وہ نظمیں مقصود ہوتی ہیں جن کا کوئی حسین موضوع ہو اور فلسفیانہ، بیانیہ اور مفکرانہ انداز میں شاعر نے کچھ خارجی اور داخلی دونوں قسم کے تاثر پیش کیے ہوں۔" (۲)

نظم کی مختلف اقسام ہیں جن میں مخصوص انداز اور مخصوص موضوعات پر ہی شاعری کی جاتی ہے مثلاً قصیدہ کا موضوع، تعریف و توصیف اور مدح سرائی ہے اس طرح مرثیہ موضوع کسی کی موت پر اظہار غم کرنا ہے جبکہ شر آشوب میں کسی ملک کی تباہی، تخریب اور بربادی اور واسوخت کو موضوع بنایا جاتا ہے غرض نظم کے زمرے میں آنے والی تمام شاعری ایک دوسرے سے بہ لحاظ موضوع مختلف ہے اور اختلاف رکھتی ہیں مگر ان کا تعلق پھر بھی نظم ہی کے قبیلے سے ہوتا ہے۔

قدماء کے ہاں بھی نظم کا وجود نظر آتا ہے۔ قدماء کی شاعری کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت پتا چلتی ہے کہ ان کی شاعری تمام کی تمام غزل، مثنوی، قصیدہ اور رباعی میں ہی بنی ہوئی اور تقسیم ہوئی نظر آتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی کا نام نظم کی دنیا میں سب سے نمایاں اور معروف و مشہور ہے۔ اگر اکبر کو نظم کا موجد کہا جائے تو کچھ غلط نہیں ہو گا۔ ان کی تمام تر شاعری نظم پر ہی مبنی ہے۔ لفظ "نظم" کا تصور سب سے پہلے حالی

کے ہاں ملتا ہے۔ انہوں نے پہلی بار اردو شاعری کی صنفِ غزل سے ہٹ کر نظم کی صنف کو فروغ دیا، نظمیں تحریر کیں اور یوں دیگر کو کبھی اس صنف کی جانب متوجہ کیا۔

انہوں نے سرسید اور مغربی ادب کے مطالعے سے نظم کی ترویج و فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ یوں نئی نظم کے آغاز کا سہرا حالی کے سر بندھا ڈاکٹر فرمان فتح پوری یوں رقمطراز ہیں:

"نظم جدید کے معنی وہ نظم ہوتی ہے جس میں اس عہد کے سارے کرب اور شعور کو ایک شاعرانہ انفرادی ضبط و جرات اور حوصلہ کی مدد سے بیانِ مسلسل میں ڈھال دے" (۳)

بنیادی طور پر دیکھا جائے تو نظم کی صنف دو اقسام میں منقسم نظر آتی ہے۔ پہلی قسم "نظمِ پابند" کی نظر آتی ہیں اور دوسری قسم آزاد نظم کی ہوتی ہے۔ نظمِ پابند ایک روایتی قسم کی حامل نظم ہوتی ہے۔ اس میں اوزان، بحر اور قافیہ اور ردیف کی پابندی کی جاتی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس آزاد نظم جسے نظمِ جدید کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اوزان، ردیف اور قافیہ کی پابندی نظر نہیں آتی اور نہ ہی اس پابندی کو اپنایا جاتا ہے۔

آزاد نظم کا آغاز جدید ارتقائی منازل کا حصول ہے۔ جدید نظم جو کہ کہا جاتا ہے کہ مغربی ادب کے اثر سے اردو ادب میں شامل ہوئی یہ مختلف اقسام کے ساتھ اردو ادب میں ہمیں رونق افروز نظر آتی ہے ان اقسام میں پابند نظم، نظمِ معری، آزاد نظم اور سانیٹ شامل ہیں ان اقسام میں نظمِ پابند سب زیادہ منفرد و یکتا اور ممتاز اس لیے گردانی جاتی ہے کہ اس میں موضوع کی کوئی قید و پابندی نہیں ہے اور پر لطف بات یہ ہے کہ یہ جدید نظم میں شامل نہیں سمجھی جاتی اس قسم کی نظموں کی تخلیق کے حوالے سے نظیر اکبر آبادی، اسماعیل میرٹھی، سرور، بے نظر شاہ، ظفر علی شاہ، اقبال، نثار اختر اور احمد ندیم قاسمی اور شبلی کے نام قابل ذکر ہیں۔

نظم کی دوسری اقسام میں اوزان کی پابندی خال خال ہی نظر آتی ہے البتہ نظمِ معری میں بحری اور وزن کی پابندی لازمی ہوتی ہے جبکہ نظمِ معری میں قافیہ کی پابندی لازمی و ضروری نہیں ہوتی اسی طرح اگر ہم آزاد نظم کو دیکھیں تو یہاں ہمیں یہ صورتحال نظر آتی ہے کہ قافیہ تو موجود ہوتا ہے۔ مگر مصرعوں کا برابر ہونا ضروری نہیں اور اس کی بنیاد ایک تحریر ہوتی ہے۔

اسی طرح سانیٹ یہ جدید نظم میں شمار کی جاتی ہے اور دورِ جدید کی پیداوار کہلائی اور سمجھی جاتی ہے اس قسم کی نظم میں چودہ مصرعے ہوتے ہیں اور اس کے حصے بھی دو ہوتے ہیں اور اس میں قافیہ مقررہ ترتیب سے لائے جاتے ہیں اس کو لکھنے کے لیے ہم کوئی بھی بحر اور وزن منتخب کر سکتے ہیں اس کے بندوں کی تعداد دو ہوتی

ہے۔ اس کے پہلے بند میں آٹھ مصرعے جبکہ دوسرے بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ نظم کی ایک روایت کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا یوں رقمطراز ہیں:

"غزل کی طرح نظم کا آغاز بھی دکنی دور سے ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دکنی دور میں نظم پہلے وجود میں آئی اور غزل بعد میں، اس کی وجہ یہ تھی کہ دکن میں شاعری کو آغاز میں مذہبی اور تبلیغی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ جس کے لیے غزل کے بجائے نظم زیادہ کارآمد تھی، دکنی نظم عام طور پر قصیدے اور مرثیے کے روپ میں ابھری۔" (۴)

نظیر اکبر آبادی کی شہرت خالص اور خاص نظم ہی کی صنف کی وجہ سے ہے انہوں نے تقریباً ہر موضوع پر نظم لکھی ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت پتا چلتی ہے کہ ان کی نظمیں خواص کے لیے نہیں بلکہ عوام کے لیے لکھی گئی ہیں اور خاص تاثر کے بجائے عام تاثر سے متصف نظر آتی ہیں ان کی ایک نظم "برسات" کو ہی لے لیں جو ہمیں موسم کی شدت اور اس کے تاثرات کے ساتھ ساتھ عوام کے متاثر ہونے کی کیفیت اور احوال بھی بتاتی ہے اور ساتھ ہی ان مشکلات پر سے پردہ بھی اٹھاتی ہے جو عوام کو اس موسم کی برکات سے درپیش ہوتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کے حوالے سے عطش درانی یوں رقمطراز ہیں:

"نظیر اکبر آبادی کو پہلا نظم گو شاعر سمجھا جاتا ہے اس سے پہلے اردو ادب میں غزل، قصیدہ، مثنوی اور رباعی وغیرہ تو ملتی ہیں لیکن نظم بہت کم نظر آتی ہے۔ تاہم یہ بالکل بجائے کہ باقاعدہ نظم گو شاعر نظیر ہے۔" (۵)

اگر ہم قیام پاکستان کے بعد کے دور پر نظر دوڑاتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ اس دور میں بھی اردو نظم کی روایت موجود تھی۔ ترقی پسند تحریک نے اور حلقہ ارباب ذوق نے ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کیا جہاں سے نظم کی تخلیق اور ترقی کے لیے موثر مساعی عمل میں لائی گئی۔ اس سلسلے میں اقبال نے فکری اور فنی طور پر باکمال اور شاہکار نظمیں تحریر کیں۔ اقبال سے پہلے کا دور نظم اگر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سے قبل یا تو مغربی تتبع کا رویہ اپنایا گیا یا پھر مغرب کو یکسر چھوڑ دینے اور ترکِ مغرب کا رویہ اپنایا گیا۔ لیکن اقبال نے ان دونوں انتہاؤں سے ہٹ کر ایک نئے رویے کو اپنایا اور ایک نئی طرح کی بنیاد ڈالی۔ وہ یہ ہے کہ نہ تو وہ مغرب پرستی میں اس قدر آگے بڑھے کہ من و عن مغربی ادب کو خود پر حاوی کر لیا اور نہ ہی یکسر ترک اور رد کا طریقہ اپنایا بلکہ میانہ روی پر گامزن ہوتے ہوئے نئی راہ متعین کی اور اپنائی۔ ڈاکٹر انور سدید اس بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"نظم میں بالعموم فرد کے ذاتی تجربے کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے لیکن اقبال نے اسے اجتماع سے خطاب کا ذریعہ بنایا اور زندگی کی جزئیات پر ذاتی رد عمل ظاہر کرنے کے بجائے پوری قوم کا تاثر پیش کرنے کی سعی کی۔" (۶)

ان تحریک اور مساعی کے بعد رومانوی تحریک نے عروج پر پایا اور اس کے نمائندہ شعراء میں سے اختر شیرانی، احسان دانش، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری اور حفیظ اللہ خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ہم پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ پچاس کی دہائی میں بھی شعبہ نظم میں بہت کام ہوا اور اس حوالے سے جن شعراء نے شہرت حاصل کی ان میں فیض احمد فیض، قیوم نظر، ن۔م راشد، مجید امجد، یوسف ظفر، احمد ندیم قاسمی، ظہور نظر، مختار صدیقی، جیلانی کامران، وزیر آغا اور ظہیر کاشمیری کے نام قابل ذکر ہیں۔ اگر ان شعراء کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے رویوں میں جو عمومی تاثر پایا جاتا ہے وہ روحانیت اور حقیقت نگاری ہے۔

۱۹۵۰ء کے عشرے میں ترقی پسند تحریک پر پابندی لگادی گئی اس دوران ہی حلقہ ارباب ذوق کا ایک نیا دور شروع ہوا اس دور کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں سیاست کی کارستانی نظر آنے لگی اور حلقہ سیاست کی آماجگاہ بن گیا۔ اس کے بعد ایوب خان کا مارشل لاء دور شروع ہوا اور اس دور کے ساتھ جو تاریخ وابستہ ہے اس میں زبان و ادب پر مختلف قسم کی پابندیاں بھی شامل ہیں اور یہی ایوب خان کے مارشل لاء کے دور میں بھی ہوا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں حلقہ ارباب ذوق دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ ان کی تقسیم ادبی اور سیاسی بنیادوں پر تھی۔ آج بھی حلقہ کی ادبی شاخیں راولپنڈی، اسلام آباد اور فیصل آباد سمیت پاکستان کے دیگر اہم اور قابل ذکر شہروں میں اپنے فرائض سرانجام دے رہی ہیں اور حلقے کی سیاسی شاخیں اپنے انجام کو پہنچتے ہوئے اختتام کی منزل سے ہمکنار ہو چکی ہیں نظم کی ترقی و ترویج اور اس صنف کے فروغ کے لیے حلقہ ارباب ذوق نے بہت اہم اور قابل قدر کردار ادا کیا اس تحریک کے حوالے سے ڈاکٹر رشید امجد یوں رقمطراز ہیں:

"ہماری قومی زندگی کو ایک ہزار سال کا فکری زوال ورثے میں ملا تھا اور ہماری نئی نظم کو ترقی پسند کا زوال ورثے میں ملا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ نہ ہم نے اپنی قومی زندگی میں سوالوں کا انتخاب کیا اور نہ نظم میں۔" (۷)

ساٹھ کی دہائی میں حالات میں کچھ بہتری آئی مختلف ادبی تحریکیں منظم ہوئیں اور انہوں نے اپنی مساعی سے ادب میں ترقی کی راہ اپنائی ان تحریکیوں کی تنظیم کو لسانی تشکیل کے نام سے نوازا گیا۔ اس تحریک

سے جو جو شعراء تعلق رکھتے تھے انہوں نے اس دور کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے ویسا ہی ادب تخلیق کیا اور صرف یہی نہیں کہ معاشرے اور افراد معاشرہ کے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا بلکہ اپنی تخلیقات کے ذریعے ان کے مسائل ان کے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر لوگوں تک پہنچایا۔ اس کے ہمراہ انہوں نے اس ضرورت کو بھی محسوس کیا کہ زبان کی ترقی و ترویج کے لیے بھی اقدامات کیے کیوں کہ ان کے خیال میں زبان صدیوں پرانے اصولوں پر رائج ہے اور وہ بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتی اور نہ ہی جدید بلوغ کی ضرورتوں کو کا محققہ پورا کر سکتی ہے۔ افتخار، جیلانی کا مران اس تحریک کے علمبرداروں میں سرفہرست رہے ان کے علاوہ اس تحریک سے وابستہ شعراء میں جو نام قابل ذکر رہے وہ انیس ناگی، تبسم کاشمیری، سلیم الرحمن، اختر احسن، عباس اطہر اور زاہد ڈار کے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد جہاں ملک عزیز میں سیاسی طور پر کافی تبدیلیاں سامنے آتی رہیں ادیبوں کی ادبی کاوشیں کہیں خاموش کونے میں خاموش پڑی رہ گئیں اور تشکیل زبان کی مساعی نے کہیں خاموشی کا لبادہ اوڑھ کے تخلیہ کر لیا۔

ستر کی دہائی ملک عزیز کے لیے کافی کٹھن ثابت ہوئی سیاسی لحاظ سے کافی مشکلات پیش آئیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور ملک کا دو لخت ہونا بہت بڑا واقعہ تھا اور اس کا نتیجہ پھر ہجرت، جدائی، موت کرب اور اپنوں سے جدائی اور دوری کی تکلیف لوگوں نے سہی۔ اس دور میں نظم میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان میں سب سے اہم انفرادیت کے بجائے اجتماعیت کا دامن تھامنا ہے اور یہ کام بندرتج ہو اور رفتہ رفتہ نظم ایک نئی ڈگر اپناتے ہوئے اپنی منزل کی جانب عازم سفر ہوئی۔ بقول ڈاکٹر رشید امجد

"نئی نظم کے سفر میں تین بڑے سیاسی موڑ ہیں۔ ۱۹۵۷ء کا انقلاب، ۱۹۶۸ء کی عوامی

تحریک اور ۱۹۷۱ء کا المیہ مشرقی پاکستان۔" (۸)

۱۹۷۰ء کی دہائی میں سابقہ دہائیوں کے سرگرم شعراء نے بھی ملے جلے طرز احساس کے ساتھ ادبی کاوشوں میں اپنا حصہ ڈالا اور نظم لکھی۔ ان پرانے شعراء کے ہمراہ نئے اور جدید سفر میں ان کا ساتھ دیا اور بہترین نظمیں تحریر کیں۔ ان نئے ابھرنے والے ناموں میں آفتاب اقبال، شمیم، امجد اسلام امجد، کشور ناہید، پروین شاکر، افتخار عارف، حسین جعفری اور احسان اکبر کا نام قابل ذکر ہے۔ ان شعراء کے ہاں جو نظمیں تخلیق کے درجے تک پہنچیں وہ فنی و فکری ہر دو لحاظ سے نئے طرز و آہنگ سے متصف تھیں۔

۹۰ کی دہائی میں جدید نظم نے اردو شاعری میں اپنا خاص مقام حاصل کر لیا۔ اس دور کی نظم میں جو خاص بات نظر آتی ہے وہ انگریزی شاعر سے متاثر ہو کر ویسے ہی مضامین اور ہئیتوں میں نظم کا تحریر کرنا شامل

ہے اس دور میں نظموں میں جو خاص اوصاف نظر آتے ہیں ان کو ہم دو رجحانات میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک رجحان داخلیت کا غالب رہا جس میں عشق، تنہائی، وجود، جنس اور دوسری جانب خارجیت نے بھی نظم میں سے اپنا حصہ لیا اس رجحان کے تحت کائنات، سماج، فطرت اور تاریخ کو لفظوں کی مدد سے منظم کر کے پیش کرنے کی سعی کی گئی۔

داخلیت کے رجحان کو اپنانے والوں اور اس کی ترقی و ترویج کے باعث شعراء میں علی محمد فرشی، سعید احمد، رفیق سندیلوی، ارشد معراج اور داؤد رضوان وغیرہ کا نام سرفہرست آتا ہے اس کے برعکس خارجیت کے علمبرداروں تائبش کمال، سید مبارک شاہ اور احمد لطیف وغیرہ نظر آتے ہیں۔

سید مبارک شاہ کی نظموں کا مزاج:

سید مبارک شاہ کا نام اردو نظم نگاری کے حوالے سے بھی معروف و مشہور ہے۔ ان کی نظمیں بھرپور توانائی اور احساس کے وصف سے متصف نظر آتی ہیں۔ انتہائی نکھار لہجے کی شگفتگی کی علامت کے طور پر نمودار ہوتا ہے مبارک شاہ کے کلام کے مطالعے سے ہم پر یہ عقدہ وا ہوتا ہے کہ انہوں غزل اور نظم دونوں میں باکمال شاعری کی ہے لیکن انکا طبعی رجحان ہمیں نظم نگاری کی جانب جھکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے جو بھی شعری مجموعے شائع ہوئے ان تمام میں غزل کے ساتھ ساتھ نظم بھی جلوہ گر نظر آتی ہے۔

سید مبارک شاہ کے کلام کے مطالعے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نظموں میں بہت سے تجربات کیے۔ ان کے ہاں ہیئت کے اعتبار سے آزاد نظموں کی تعداد زیادہ ہے مگر وہ پابند نظموں کو بھی بڑی مہارت کے ساتھ تخلیق کرتے رہے ہیں۔ اور ان پابند نظموں میں بھی ہیئت کے مختلف تجربات کرتے نظر آتے ہیں ان کے اس رویے سے ہم پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ وہ غزل کی صنف کے مقابلے میں نظم کی صنف کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اور اپنی مہارت کا اظہار وہ نظم میں پسند کرتے ہیں۔

موضوعات کا انتخاب صنف نظم میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور موضوعات کی رنگارنگی نظم کی شاعری کو مزید موثر بنادیتی ہیں اور قاری کو مطالعے کے دوران بے زاری کا احساس نہیں ہوتا، بلکہ ہر نیا موضوع اس کی توجہ اپنی جانب کھینچنے کی صنف سے متصف ہوتا ہے اور یہ رنگ ہمیں سید مبارک شاہ کی نظموں میں بدرجہ اتم نظر آتا ہے قرآن، تاریخ، اقبالیات اور قدیم اسلامی تہذیب کے مطالعے سے سید مبارک شاہ کو موجودہ دور کی زندگی اور اس کے مسائل نے اپنی جانب متوجہ کر رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں

ہمیں ان مسائل کا ذکر ان پر فکر مندی اور ان کے حل کی خواہش نظر آتی ہے اور وہ مشاہدات اور تجربات کو پرکھتے ہوئے آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔ مذہب، سیاست، معاشرہ، تصوف، انتظار وحشت، سکون، بارش، یقین، اعتبار اور جشن جیسے متنوع موضوعات پر سید مبارک شاہ کے ہاں بہترین اور رنگارنگ قسم کی نظمیں موجود ہیں جو پر لطف اور پر خیال ہونے کے ساتھ ساتھ شوکتِ الفاظ کی بھی حامل ہیں سید مبارک شاہ نے اپنی نظم میں خدا اور انسان اور کائنات اور ان کے تعلق کو موضوع بنایا ہے اور ایک الگ راہ متعین کر کے نئی راہوں پر عازم سفر ہوئے۔ ان سے قبل نظم کا جو عام تاثر تھا اس کو انھوں بدل کر رکھ دیا۔ الہیات کے مسائل مبارک شاہ کے پسندیدہ موضوعات کے بیان میں ہمیں ان کی مختلف حیثیات نظر آتی ہیں وہ بیک وقت شاعر بھی ہیں متکلم بھی، صوفی بھی ہیں اور عاشق بھی اور سونے یہ سہاگہ تو یہ رہے کہ وہ ان معاملات کی نزاکت کو نہ صرف کہ سمجھتے ہیں بلکہ لگتا ہے کہ وہ خود ان معاملات سے گزرتے ہیں۔

اگر ہم شاعری کے حوالے سے بات کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ غزل کے علاوہ شاعری کی تمام اصناف اور اقسام "نظم" کے زمرے میں آتی ہیں تاہم کئی اقسام میں تقسیم کی جاتی ہے سید مبارک شاہ نے بھی نظم کی مختلف اقسام پر طبع آزمائی کی ہے مثلاً

۱۔ حمد:

"حمد" اردو نظم کا حصہ بالکل ابتداء سے ہی رہی ہے۔ "حمد" ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں خدائے بزرگ و برتر کی تعریف و توصیف کی جائے۔ اور اس کے کمالات اور تخلیقات کا ذکر کیا جائے۔ مشاہدے میں عموماً یہ بات آتی ہے کہ اردو نظم کی ہیئت "حمد" میں کچھ عناصر روز اول سے ہی مستقل اور مسلسل چلے آ رہے ہیں ان میں ایک اللہ تعالیٰ کی توحید و یکتائی اور اس کی ذات اور صفات کو صرف اور صرف اسی کے لیے مخصوص کرنا اور اسی سے منسوب کرنا ہے، اس کی ہستی کو لامتناہی ماننا اور قائم بلذات سمجھنا، اس کائنات کو اس کے حصار قدرت و قوت میں محصور کرنا اور تمام حرکات و سکنات کا نتیجہ سمجھ کر اس کی ذات کو محور و "محرك اول" قرار دینا۔ ایک اہم اور غالب موضوع کے طور پر شامل رہا ہے۔

سید مبارک شاہ نے اللہ رب العزت کی حمد و ثنا اور تعریف و توصیف کو بیان کرنے کی غرض سے "بنام خدا" کے نام سے نظم تخلیق کی جس میں انہوں نے اللہ کی "قادر مطلق" ہونے کی صفت اور اس کی یکتائی اور لافانیت اور ثبات کی خصوصیت پر نظر ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ ہماری زندگی اور انسان کی حیات کے

لیے زمانوں کی ضد ہے حدودِ وقت ہیں جیسے صبح و شام، ماہ و سال، ماضی و حال و مستقبل، لیکن تو ان سے آزاد ہے تو تھا، ہے اور مستقبل میں بھی صرف اور صرف تو ہی ہو گا یعنی وقت کا تصور تیرے لیے نہیں بنا، ابتداء اور اختتام سے تو ناواقف ہے۔ جنت، جہنم یہ سب انسانوں کے لیے ہیں۔ تو ہمیشہ سے ایک تھا ایک ہے اور رہے گا تو تو خدا ہے جو لا فانی اور قائم و دائم رہے گا فنا تیرے لیے نہیں تو بقا کا مالک ہے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

بنامِ خدا

اے خدائے زندگانی!

تجھے کیا کہوں کہ کیا ہے

مری عمر مختصر میں

یہ شمارِ عہدِ رفتہ

وہ حسابِ عمر فردا

یہ گئی رتوں کے چر کے

وہ نئی رتوں کے دھڑ کے

کبھی تیرے دل پہ گزریں

اگر ایسی وارداتیں

مگر ایسی وارداتیں

ترے دل پہ کیسے گزریں

کہ تو وقت کے تصور

سے ہی آشنا نہیں ہے

تری ابتدا نہیں تھی

تری انتہا نہیں ہے

ترا حال ہے نہ ماضی

نہ تجھے گمانِ عُقبیٰ

کہ تو دشتِ لامکاں میں
 ہے اسیر جاودانی
 اے خدائے زندگانی
 تو ازل ازل کا تنہا
 مرے سانچے سے شاہد
 ترا المیہ بڑا ہے
 ترا دردِ دلا دوا ہے
 تو خدا ہے، لا فنا ہے

(جنگل گمان کے، صفحہ: ۳۸)

۲۔ نعت:

نعت اصل میں عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغت کے اعتبار سے معنی تعریف کرنے کے ہیں اصطلاح میں نعت سے مراد وہ شاعری ہے جس میں پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی تعریف و توصیف کی جائے سید رفیع الدین اشفاق، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

"اصولاً آنحضرت ﷺ کی مداح سے متعلق نثر اور نظم کے ہر ٹکڑے کو نعت کہا جائے گا لیکن اردو اور فارسی میں جب نعت کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے عام طور پر آنحضرت ﷺ کی منظوم مداح مراد لی جاتی ہے۔" (۹)

اگر ہم اردو شاعری میں نعت کے حوالے سے ابتداء کا زمانہ دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ جیسے دکنی نظم و نثر کا باقاعدہ آغاز عام طور پر حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے کیا جاتا ہے اسی طرح نعت گوئی کا آغاز بھی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب ہے اس کے بعد مختلف ادوار میں مختلف شعراء نے اس میدان میں طبع آزمائی کی اور مداحِ مصطفیٰ کو اپنا موضوعِ سخن بناتے رہے تاہم اردو نعت گوئی کی تاریخ میں نمایاں نام مولانا امام احمد رضا خان بریلوی، مولانا حسن رضا خان حسن بریلوی، حضرت شاہ نیاز بریلوی، محسن کاکور کوی، مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر اور زائرِ حرم حمید صدیقی لکھنوی کے ہیں۔ حضرت علامہ محمد اقبال ایک سچے

عاشق رسول تھے۔ آپ نے بھی حضور اکرمؐ کی مداح اور مدحتِ مصطفیٰ سے سرشار شاعری کی ہے۔ مثال
ملاحظہ ہو۔

لوح بھی تو قلم بھی تیرا وجود الکتب
گنبد آ بگینہ رنگ ترے محیط حباب

اسی طرح وہ حضور اکرمؐ کی محبت کو سارے جہان کی محبت کے قابل بنانے کی چابی اور وجہ اور ذریعہ
سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کامیابی محمدؐ سے وفا کی بنا پر ہی مل سکتی ہے

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

سید مبارک شاہ اقبال سے متاثر ہی نہیں بلکہ وہ بھی ان کی طرح محمد ﷺ سے محبت کا اظہار کرتے
ہوئے نعت گوئی کرتے نظر آتے ہیں وہ یوں رقمطراز ہیں:

اے محبت کے پیہر تو وفاؤں کا امیں
باعثِ تخلیق عالم درد مند عالمیں

(جنگل گمان کے، ص: ۴۰)

کتاب "جنگل گمان کے" میں سید مبارک شاہ نے نظم "بنام رسول" کے نام سے لکھی جو دراصل ایک
نعت ہے اس نظم میں سید مبارک شاہ حضور اکرمؐ کی صفات بیان کرتے ہیں اور ساتھ ہی وہ امت مسلمہ سے
نالائاں ہوتے ہوئے گلہ شکوہ بھی کرتے نظر آتے ہیں کہ یہ امت اب برائے نام مسلم امت نظر آتی ہے وہ اس
نظم میں رسول کریم ﷺ مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے محمد ﷺ تو صادق الامیں ہے اور کائنات
صرف اور صرف تیری وجہ سے تخلیق کی گئی تو یہی وجہ تخلیق کائنات ہے اور تیرے نام پر دین کی بنیاد رکھی گئی
ہے تیری ہستی وہ ہے جو بے سہاروں کا واحد کیتا سہارا ہے تو بے کسوں کا والی اور داتا ہے تو عادل ہے انصاف
کرنے والا ہے جب ہم خود کو تیرا امتی کہلاتے ہیں ہم بہت ظالم اور ناانصافی کرنے والے ہیں ہم تیرے امتی
ہونے کے دعویدار ضرور ہیں مگر تری سنت پر کہاں عمل کرنے والے ہیں؟ بلکہ ہمارا حال تو یہ ہے کہ:

آج دعویٰ کر رہے ہیں ہم تیری تقلید کا
ہم جو زعم رہبری میں کارواں کو لوٹ لیں

(جنگل گمان کے ج، ص: ۴۰)

ایک جگہ پر وہ یوں رقمطراز ہیں:

تیرا شیوہ عدل کی فرماں روائی کافروغ
اور ہمیں خوشنودی فرماں رواں مطلوب ہے

(جنگل گمان کے، ص: ۴۰)

ہم خود غرض اور انا پرست مسلمان ہیں ہم خود غرض اس قدر کے نہ اپنے آس پاس رہنے والے
لوگوں کا خیال ہے نہ بہن بھائیوں اور والدین کا حق ادا کرتے ہیں جب کہ آپ کی تعلیمات تو یہ ہیں کہ آپ نے
سب سے زیادہ حق اپنے ہمسائے کا ادا کرنے کا حکم دیا اور یوں حقوق العباد کی اہمیت پر زور دے کر یہ حقوق
بجالانے کا حکم دیا مگر ہم تو اتنے حقیقی رشتوں سمیت سب کے حقوق سے چشم پوشی کیے ہوئے زندگی میں
صرف آگے بڑھنے اور مزید کے حصول کی دوڑ میں مصروف ہیں اس بارے میں سید مبارک شاہ یوں رقمطراز
ہیں:

تو نے بس اس شخص کو محروم جنت کہہ دیا
جس کے ہمسائے کبھی فاقہ کشی میں سو گئے
ایک ہمسایہ تو کیا اے رحمت اللعالمین
ہم تو نسلوں کے لیے فاقوں کی فضلیں
بو گئے

(جنگل گمان کے، ص: ۴۱)

۳۔ قصیدہ:

قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے جو لفظ "قصد" سے مشتق ہے۔ اور قصد کے معنی "ارادہ" کے ہیں۔ بقول
ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

"اصطلاحاً قصیدہ اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور
بقیہ اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوں اور جس میں مداح،
نصیحت و موعظمت یا مختلف کیفیات و حالات وغیرہ کا بیان ہو۔" (۱۰)

قصیدہ کسی حیات شخص کا لکھا اور تخلیق کیا جاتا ہے اس کے علاوہ کسی عظیم المرتبت مذہبی شخصیت کا قصیدہ بھی لکھا جاتا ہے۔ قصیدہ میں عام طور پر شاعر کسی شخص کی تعریف کرتا ہے اس کے اوصاف اور کمالات کو بیان کرتا ہے اور یہ سب وہ انعام کے حصول کے لیے بھی کرتا ہے۔

قصیدے کے عناصر ترکیبی میں تشبیب، گریز، مدح، حسن طلب اور دعا شامل ہیں۔

قصیدے کا فن عربی زبان و ادب سے فارسی ادب میں پہنچا۔ فارسی میں میں رودکی، فرخی، عنصری حاقانی اور تہنی جیسے عظیم قصیدہ نگاروں کے نام سرفہرست ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں وارد ہوئے تو فارسی زبان بھی ساتھ لے کر آئے اور یوں فارسی ادب کی بہت ساری اصناف بعد میں خود بخود ہی اردو ادب کا حصہ بنتی گئیں قصیدہ اردو ادب میں فارسی کے توسط سے ہی آیا۔

دکن میں نصرتی، شاہی، غواصی، وجہی اور قلی قطب شاہ کے ہاں اولین قصیدوں کے نمونے ملتے ہیں۔ بعد میں دہلی میں مرزا رفیع سودا نے اس فن کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ لکھنؤ میں انشاء کے قصائد معیاری گردانے جاتے ہیں اس کے بعد دہلی میں مومن، ذوق، اور غالب، کے ہاں ہمیں قصائد کی بہترین مثالیں ملتی ہیں البتہ ذوق سب سے بازی لے جاتے دکھائی دیتے ہیں انہوں نے اس فن میں کمال مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہترین قصائد تحریر کیے سودا کا نام سب سے معتبر گردانا جاتا ہے اردو قصائد کے ضمن میں عام تاثر یہ ہے کہ ان سے قبل اردو قصیدہ کسی صورت بھی فارسی قصیدے کے معیار پر نہیں پہنچ سکا تھا۔

"سودا اردو کے پہلے قصیدہ نگار ہیں جن کے قصائد فارسی کے اچھے قصیدہ نگاروں کے

مقابلے میں لائے جاسکتے ہیں امداد امام اثر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "اردو میں جو کچھ

ہیں حضرت سودا ہیں۔ اگر سودا نہ ہوتے تو اردو کی قصیدہ گوئی کو زیر بحث لانا فضول

تھا۔" (۱۱)

سید مبارک شاہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شخصیت سے خاص لگاؤ اور انس رکھتے تھے چنانچہ سید مبارک شاہ نے اپنے کلام میں ان کے لیے ایک قصیدہ بنام "علی" تخلیق کیا اس قصیدے میں سید مبارک شاہ حضرت علیؑ کے بارے میں کہتے ہیں کہ آپ تو نبی کریمؐ کے مکتب کے فارغ التحصیل طالب علم ہیں اور علم و فضل میں کمال کے درجے پر پہنچے ہوئے ہیں اور اس میں یہ کہا گیا ہے کہ کوئی لاعلم اور جاہل شخص آپ کے مرتبے اور قدر و منزلت کا اندازہ نہیں لگا سکتا بلکہ آپ تو علم کے شہر کا دروازہ ہیں اور علم کا شہر حضرت محمد ﷺ ہیں۔ نظم "علی" کچھ حصہ ملاحظہ ہو۔

ترے علم و فضل و کمال کی
 سر بزمِ حق بڑی دھوم ہے
 کسی ابنِ جہل پہ کیوں کھلے
 کہ تو بابِ شہرِ علوم ہے
 کہاں تجھ سا کوئی معتبر
 کہ تو ابروئے بتولؑ ہے
 ہو انیس تجھ سا کہاں کوئی
 تو انیس جانِ رسول ﷺ ہے
 تو ہر ایک روپ میں معتبر
 کبھی شانِ چادرِ فاطمہؑ
 کبھی سرِ ظرفِ حسینؑ تو
 کبھی زغمِ حضرتِ مصطفیٰ ﷺ

(جنگلِ گمان کے، ص: ۱۵۶)

اس نظم میں سید مبارک شاہ حضرت علیؑ کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو تمام تر معزز و معتبر ہے
 کوئی معتبری میں تجھ سے آگے نہیں ایک طرف تو حضرت فاطمہؑ کی آبرو عزت و تکریم ہے اور دوسری جانب
 ان کا نگہبان و سرپرست بھی ہے اور حضرت حسینؑ جیسی افضل ہستی کے والد ہونے کا درجہ بھی بہت قابلِ
 قدر ہے اور پھر انہیں غیرتِ مصطفیٰ کے درجے پر فائز کرتے ہیں۔

"علیؑ" نظم کے بعد سید مبارک شاہ کی ایک اور نظم "شاعرِ محبت کے نام" بھی قصیدہ کی ایک بہترین
 مثال سے اس میں انھوں نے فیض احمد فیضؒ کی تعریف کی ہے یہ نظم ان کی سا لگرہ کے موقع پر انھوں نے لکھی
 نظم ملاحظہ ہو:

شاعرِ محبت کے نام
 (فیض کی سا لگرہ کے موقع پر)
 خزاں جو آئی تو تیرے سینے میں

کھل گئے ہیں
 بہار موسم کی آرزو کے گلاب کتنے
 جو دیکھنے پر لگی ہے قد غن
 تو تو نے دیکھے ہیں
 دیدنی کے حسین موسم کے خواب کتنے
 سراب دیکھے
 تو تیری آنکھوں میں پھر سمندر مچل گئے ہیں
 تو اس اندھیرے میں تو نے روشن کیے ہیں سینے کے داغ سارے
 (جنگل گمان کے، ص: ۱۵۷)

سید مبارک شاہ نے اس نظم میں فیض احمد فیض کی رجائیت پر امید ہونے کا وصف اور بہادری سے
 خزاں کے موسم اور برے حالات سے مقابلہ کرنے کی خوبی کو بیان کیا ہے کہ کیسے نامساعد حالات بھی انہیں
 زندگی اور اس کی رنگینیوں سے مایوس نہ کر سکے انہوں نے اندھیروں میں روشنی کے مینار تلاش کیے اور انہیں
 دوسرے لوگوں کے لیے بھی مشعل راہ کی صورت چھوڑا۔ انہوں نے مشکلات میں مقابلہ کی روش کو اپنایا اور
 ہمیں بھی اسی پر گامزن رہنے کا درس دیا۔ محبتوں کے فقدان کے زمانے میں بھی محبت کی تقسیم اور تشہیر کو اپنا
 فریضہ سمجھا اور اپنی تکلیفوں، مشکلات اور دکھوں کے ہوتے ہوئے اپنے سینے کے داغوں سے دنیا کو روشن کیا
 اور اہل حق کے لیے مینارِ نور کا کام کیا حق گوئی و بے پاکی کو اپنا ایمان بنایا اور دوسروں کو بھی اس ڈگر پر چلنے کی
 تلقین کی اور خوشگوار مستقبل کی نوید سناتے رہے۔

سید مبارک شاہ کے ہاں سقراط کی تعریف اور اس کی قربانی کی وجہ سے خلق خدا کی خوشی کا بندوبست
 کرنے سقراط کے نام کا قصیدہ نظم حریص کی صورت میں اُن کی کلیات میں کچھ اس رنگ سے جلوہ گر ہے:

حریص

وہ کس جہاں کے ہوس میں ہوں گے
 جنہوں نے دنیا تیاگ ڈالی
 نہ جانے کیسے حریص ہوں گے

جنہوں نے خواہش کو مار ڈالا

جب اس عشرت کدے کو چھوڑا
تو کتنے دکھتے ہوئے گھروں میں
اک انبساطِ عظیم ترکی نوید پہنچی
بس ایک بستی کی حکمرانی تیاگنے پر
وہ اک زمانے کے حکمرانوں کا دیوتا تھا

طلوعِ دوراں کا پہر کیا تھا
کہ شامِ زنداں دمک رہی تھی
وہ زہر کیا تھا
کہ پینے والا یہ پوچھتا ہے
پلانے والے کہاں گئے ہیں
وہ ایک لمحہ بتا بتا کے بتاؤ کتنے زماں گئے ہیں

(مدارِ نارسائی میں، ص: ۴۰۰)

اس نظم میں سید مبارک شاہ نے سقراط کی قربانی اور جانثاری کا ذکر کر کے اس کی تعریف کی ہے اور یہ
قصیدے کی ایک اچھی شکل ہے۔ اسی طرح ان کی نظم "الّا ابلیس" میں انھوں نے شیطان کی تعریف کی ہے
اور اس کے کردار اور اس کے اعمال کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہوئے اس کے عقیدہ توحید کا ذکر کیا ہے نظم
ملاحظہ ہو:

جس نے مٹی کے بت کو نہ سجدہ کیا
روزِ اول سے جو منکرِ شرک تھا
جز ترے جس کی نظروں میں کوئی نہ موجود تھا
تیرا مردود تھا؟
جس کے پیشِ نظر تیری تقدیس تھی

کس قدر وسعتِ ظرفِ ابلیس تھی

جس نے ہر حال میں تیری لوحِ ازل کا بھرم رکھ لیا
جس نے تیرے لیے بے طلب راستوں پر قدم رکھ لیا

(جنگل گمان کے، ص: ۱۵۸)

اس نظم میں سید مبارک شاہ نے برخلافِ روایت دیگر شعراء سے ہٹ کر ابلیس کی خوبیوں کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ اللہ کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس نے آدم کے سامنے جھکنے اور سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اس کی نظر میں وہ معبود کا درجہ صرف اللہ ہی کے لیے روا سمجھتا ہے کسی اور کے سامنے سجدہ کر کے وہ مشرک نہیں بن سکتا تھا اس لیے اس نے انکار کیا۔

اور اس انکار سے اسے کیا ملا؟ کیا اس کو کوئی فائدہ ہوا؟ نہیں بلکہ وہ تو اپنے مقام سے بھی جاتا رہا اور تیرا مردود بن گیا تو اس سے ناراض ہو گیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راندہ درگاہِ خداوندی ٹھہرا۔ اس نظم میں سید مبارک شاہ نے ابلیس کی ہستی کا قصیدہ پڑھا ہے اسی طرح نظم "تنسیخ" میں بھی قصیدے کا سا تاثر ملتا ہے وہ "سکہ رائج الوقت" کی توصیف میں کچھ یوں رقمطراز ہیں:

تنسیخ

سکہ رائج الوقت تیری چمک ماند پڑتی نہیں

سکہ رائج الوقت تیری مہک تیری بوسیدگی سے سوا

بس یہ اک بار سانسوں میں بس جائے تو

باس بوسیدہ افکار و اقدار و معیار کی

اور تیرا لمس اے سکہ رائج الوقت!

راس آئے جس کو بھی، پتھر بنادے اسے

اور زمانہ اسے سنگِ پارس کہے

(ہم اپنی ذات کے، کافر: ۲۴۱)

بہت خوبصورت، انوکھے اور منفرد انداز میں سکھ رائج الوقت کی حقیقت اور اہمیت کو موضوع بحث بنا کر اس کے اوصاف اور خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے سکھ رائج الوقت کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے اور بہت فنکاری سے خوبصورت انداز اور الفاظ سے اس کی حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

اسی طرح ان کے کلام میں ہمیں قصیدے کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ جو مذکورہ بالا امثال سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔

۴۔ خدا اور انسان کا تعلق:

سید مبارک شاہ کی شاعری کا مطالعہ کرنے بعد قاری اس نتیجے پر آسانی سے پہنچ جاتا ہے کہ ان کی شاعری کا بنیادی اور مرکزی نقطہ اور موضوع خدا اور انسان کا تعلق ہے۔ انہوں نے اپنے کلام اور اپنے جذبات و احساسات کے ذریعے اس تعلق کی وضاحت اور تعبیر نو کی ہے اس تعلق کی وضاحت اور تعبیر کی نوعیت صرف اور صرف ذاتی نوعیت کی ہے جو ان کے اپنے احساسات جذبات اور تجربات روحانی پر مبنی ہیں اور روحانی تجربات کے بعد یہ تعبیر وجود میں آئی ہے۔

انسان اور خدا کا تعلق ایسا تعلق ہے جو صدائے درد مند جو دراصل

یا ایھا الانسان ما غرک بریک الکریم

کا جواب ہے۔ انسان کو بار بار دعوت غور و فکر دی جاتی ہے کہ کائنات اور اس کی تمام اشیاء و مخلوقات پر غور کرو تو اس رب کے بارے میں تمہارے ذہن میں موجود وہ ہے ایک دم توڑ دیں گے اور تم اپنے رب کو پہچان جاؤ گے۔ سید مبارک شاہ نے انسان اور خدا کے تعلق کے حوالے سے اپنے کلام میں کچھ اس طرح اپنے خیالات کو پیش کیا ہے۔

کبھی تم نے یہ سوچا ہے

کبھی تم نے یہ سوچا ہے

دعائیں گڑ گڑا کر مانگنے والو!

اسے آواز دیتے ہو

جو برسوں سے تمہارا اپنا سینہ کھٹکھٹاتا ہے

اسے کیا دیکھ پاؤ گے؟

جو تاحدِ نظر ہو کر بھی بینائی میں رہتا ہے
 دیارِ غیب سے اس کو بلاتے ہو!
 جو حاضر خود تمہاری اپنی تنہائی میں رہتا ہے۔

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۲۸۴)

اس نظم کے مندرجہ بالا سطور پر سید مبارک شاہ انسان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ وہ خدا جسے ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں جس سے دعائیں مانگتے ہیں اور جسے پکارتے ہیں اس یقین اور اعتقاد کے ساتھ کہ وہ موجود ہے اور ہماری صدائیں سنتا ہے اور یہی نہیں بلکہ ہماری دعائیں پوری کر کے ہماری صداؤں کا جواب دیتا ہے تو کیا ہمیں اسے دیکھنے کے لیے ظاہر کی آنکھ ہی کافی ہے۔ سید مبارک شاہ کا کہنا ہے کہ اسے دیکھنے کے لیے ہمیں کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی وہ دور دراز مقامات یا مشکل گھاٹیوں سے گزرنے کے بعد نظر آئے گا بلکہ وہ تو اپنے من میں جھانکنے پر مل جاتا ہے وہ تو ہمیشہ سے ہمارے دل میں موجود ہے انسان کا سینہ اور اس کا دل دراصل اللہ کا گھر ہے خدا کا مسکن ہے اور وہ خدا اور انسان اتنے قریب ہیں کہ وہ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ وہ رب انسان کی طرح نہیں قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ "کیا تم اسے اپنے جیسا گمان کرتے ہو" قرآن یوں گویا ہوتا ہے:

لیس کملہ شیء

بلکہ وہ تو اپنے بندے سے اس قدر قریب اور نزدیک ہے کہ خود قرآن میں کہتا ہے:

نحن اقرب الیہ من حبل الوريد

وہ تو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

اور وہ تو ہماری بینائی میں متمکن ہے جو ہم دیکھتے ہیں وہ دراصل وہی خدا ہمیں دکھاتا ہے جو وہ نہ چاہے ہم کسی چیز کی اصلیت اور حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے۔

وہ خدا تو اپنے بندوں کو تنہائی میں بھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر انسان کے پاس کوئی نہ ہو تو دراصل تب بھی وہ اکیلا نہیں ہوتا بلکہ خدا اس کے ساتھ اس کے چاروں جوانب موجود ہوتا ہے۔ اور یہی اس کے اور اس کے رب کے گہرے تعلق کی روشن مثال اور ضمانت ہے۔

دراصل انسان جب اس کائنات میں بھیجا گیا اس وقت سے اس کے خالق کی یہ سعی رہی کہ وہ کہیں بھی تنہا اور اکیلا نہ رہے تو اسے اس کی حیات کے مقصد سے آگاہ کرنے اور اس کی رہنمائی کی غرض سے اس

کے لیے پیغمبر اور انبیاء بھیجتا رہا تا کہ وہ کہیں بھی بھٹک نہ جائے مگر اہ نہ ہو جائے اور اپنی منزل کی جانب کامیابی سے گامزن رہے ان تمام انبیاء و پیغمبروں نے انسان اور ذات باری کے قرب کی کوشش کی یہ اور بات ہے کہ بعد میں انسانی معاشرے کے دیگر افراد اور اداروں نے اس مقصد میں رخنہ ڈالا یا انسان کو خدا کے قریب ہونے سے روکتے رہے۔ یوں رفتہ رفتہ اخلاص اور ایمان کی جگہ رسمی جملے اس کی زبان پہ عام ہونے لگے۔ سید مبارک شاہ بھی اس کیفیت سے بیزاری کے علمبردار ہیں وہ ایمان اس کو مانتے ہیں جو تصدیق، توثیق اور شہود سے لبریز ہو۔ وہ نام نہاد اور کھوٹ ہے جو بودے سے نہ صرف بیزار ہیں بلکہ ایسے جذبوں کو قابلِ تحریر گردانتے ہیں ان کے خیال میں جو لوگ اپنے جذبوں میں خالص ہوتے ہیں وہ دینا والوں کی تنقید کا نشانہ بنتے ہیں یوں روش عام یہ ہے کہ لوگ منافق ہیں وہ صرف زبان سے خدا کے وجود کا اقرار کرتے ہیں اور ان کے ایمان اور اخلاص میں کھوٹ ہے ان کی نظم "مرے سب خواب سچے ہیں" میں وہ ایسے ہی جذبات کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں:

مرے سب خواب سچے ہیں

میں اپنے خواب میں دیکھوں

خدائے لازماں اپنے

مکانِ لامکاں کی چھت پہ بیٹھا مسکراتا ہے

اچانک اس کی نظریں مجھ پہ پڑتی ہیں

تو وہ مجھ کو اشاروں سے بلاتا ہے

مگر کچھ سوچ کر ہنستا ہوا نیچے اترتا ہے

زمین پر جب وہ آتا ہے

تو اس کے خوش نما چہرے سے دھرتی یوں دمکتی ہے

کہ تارے، چاند سورج سب زمیں سے

روشنی کی بھیک لیتے ہیں

زمین کتنی منور ہے کہ اس کے نور سے

سورج کا سایہ آسمانوں پر لرزتا ہے

مرے شانے پہ اپنا ہاتھ رکھ کر مجھ سے کہتا ہے کہ
"میرے پاس بیٹھو گے؟"

تو پھر ہم بیٹھ جاتے ہیں
میں اس سے لامکاں کی وحشتوں کا
اور وہ مجھ سے

زمین پر پھیلے سنائے کا جب احوال سنتا ہے
تو اس کے خوش نما چہرے پہ پھیکا سا تبسم پھیل جاتا ہے
اچانک شور اٹھتا ہے

"جگاڈالو! جگاڈالو! اسے سونے نہیں دینا
یہی ہے جو خدا کو اپنے خوابوں میں بلاتا ہے
خدا جانے اسے کیا کچھ بتاتا ہے"
تو ہم اک دوسرے کو بے بسی سے دیکھتے ہیں
اور کہتے ہیں کہ اچھا پھر-----
مگر پھر

مجھ کو پتھر قہقہوں کے ایک پل سونے نہیں دیتے
وہ مجھ پر اتنا ہنستے ہیں، مجھے رونے نہیں دیتے
دروغ صبح کاذب کی قسم لے لو
یہ میرے خواب سچے ہیں
مگر اب میری آنکھوں میں نہیں بستے

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۲۰۳)

ایک اور جگہ وہ انسان کے دل میں اٹھتے ہوئے شکوک و شبہات کو کچھ اس طرح اشعار کے قالب میں
ڈھالتے ہیں:

ایک لا وجود نظم

"چلو اس کو ڈھونڈیں جو شاید نہیں ہے"

"نہیں ہے تو آخر کہاں مل سکے گا!"

"تمنا سے باہر

تخیل سے آگے بھی موجودگی ہے"

"مگر ان علاقوں سے کس کا گزر ہے

ازل کے ادھر یا ابد کے ادھر تم

جہاں پاؤں رکھوں گے امکانیت ہے"

اس امکانیت سے ذرا اور آگے

جہاں کچھ نہیں ہے

جہاں ہم کھڑے ہیں

یقیناً وہیں ہے جو شاید نہیں ہے

(مدارِ نارسائی میں، ص: ۴۳۹)

یعنی انسان اس رب کو تلاش کرتا ہے جو ابد سے ہے ازل تک وہ رہے گا اور جو ہر کہیں ہے جہاں کچھ

نہیں ہوتا وہاں وہ ہوتا ہے اور جہاں کچھ نہیں ہوگا ادھر بھی وہ ہوگا کوئی جگہ کوئی گوشہ ارض اس کی ذات اور

موجود سے عاری اور خالی نہیں وہ ہر کہیں موجود ہے۔ اسی خیال کو درد کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا

تو ہی آیا نظر جیدھر دیکھا۔

اور غالب نے تو کمال کر دیا یہ کہہ کر کہ

کچھ نہ تھا تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے سے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یوں ہر جگہ اس کا امکان ہے اس کی ذات ممکن ہے اور وہ اُدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے اور وہ اس جگہ بھی ہے جہاں ہم نہیں جہاں کچھ نہیں۔ وہ عدم سے اور ازل تک رہے گا اسی بات کا ایمان رکھنا بندے اور خدا کے تعلق کی واضح اور واحد وجہ اور بنیاد ہے۔

ایک اور نظم میں سید مبارک شاہ دنیا کے مفکروں کو پکارتے ہوئے دعوتِ فکر کا کچھ یوں اظہار کرتے ہیں۔

اعراف

سوالیہ نشان کی قطار میں کھڑے ہوئے مفکرو!

وہ کون، کیسا، کس لیے، کہاں پہ، کب سے، کب تلک؟

سوالِ شش جہات کا جواب کوئی اب تلک؟

جو مل گیا تو کھل سکے نہ کیوں کسی کے لب تلک؟

(مدارِ نارسائی، ص: ۱۴۱)

کہ وہ خدا جو رب ہے جو شہ رگ سے قریب تر ہے اس کے بارے میں جاننے والا اور نہ جاننے والا برابر ہیں جو اس کے بارے میں جان گیا وہ بھی بے بس و ناتواں ہے اس کی ذات کے بارے میں کچھ کہنے کا اس میں یارا نہیں اور جو نہیں جانتا وہ بھی بے خبر ہے حالی نے اسی خیال کو کیا خوب بیان کیا ہے۔

محرم بھی ہے ایسا ہی جیسا کہ ہے نا محرم

کچھ کہہ نہ سکا جس پہ یاں بھید کھلا تیرا

وہ ذات تو انسان کے اندر بستی ہے اور یہ تعلق اتنا گہرا ہے کہ اسے نہ تو ظاہر کی آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس تعلق کو ہماری ظاہر کے جامے میں ملبوس دیکھ سکتے ہیں یہ تعلق محسوسات سے تعلق رکھتا ہے اور انتہائی گہرا اور مضبوط تعلق ہے اسی تعلق سے متصف ہو کر انسان اپنے رب کی ذات کا عرفان حاصل کر سکتا ہے۔ اور یہی انسانیت کی معراج ہے۔

۵۔ عرفانِ ذاتِ الہی:

انسان اگر رب کو جاننا چاہتا ہے تو اس سے پیش تر وہ خود کو جاننے اپنی ذات کا عرفان حاصل کرے۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن نے انسان کو بار بار دعوتِ غور و فکر اور دعوتِ تدبیر دی ہے اور اپنی ذات پر غور و فکر کرنا اولین کام قرار دیا اور اسی کو اولیت دی اور کہا ہے۔

و فی آنفسکم افلا تبصرون

کیوں کہ رب کو جاننے کے لیے خود کو جاننا از بسکہ ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے لیے اس پر ایمان لانے کے لیے اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنا ضروری ہے۔ کہا گیا:

من عرف نفسه فقد عرف ربه

تو طے یہ ہوا کہ عرفانِ رب کا سفر عرفانِ نفس سے ہی شروع ہوتا ہے۔ اب عرفان چاہے رب کا خدا کا خود انتہائی وسعتِ نظری کا متقاضی ہے۔ بصارت کے ساتھ بصیرت نہ ہو تو یہ سفر ممکن نہیں سید مبارک شاہ نظم "ہم اپنی ذات کے کافر" میں یوں رقمطراز ہیں:

ہم اپنی ذات کے کافر

ہم اپنی کم نگاہی کا

عجب اظہار کرتے ہیں

کہ جو آنکھوں سے او جھل ہو

اسے تسلیم کرنے سے سدا انکار کرتے ہیں

جو سنتے ہیں

کہ تخلیقِ زماں سے بھی بہت پہلے

کہیں ہم لوگ رہتے تھے

فنائے وقت سے آگے

ہمیں موجود ہونا ہے

تو ہم اپنے تحیر کو جھٹک کر

اس لیے انکار کر دیں گے

کہ ہم نے اپنے چہرے کو

گزشتہ چند برسوں ہی سے دیکھا ہے

یہ صورت کچھ ہی مدت بعد آئینے نہ دیکھیں گے

یہ معیارِ نظر بنیادِ منطق ہو

تو پھر اس کے تناظر میں
ہم اپنی ذات کے کافر
تمہاری کیا گواہی دیں

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۳۸-۲۳۷)

سید مبارک شاہ کا کہنا ہے کہ انسانوں میں سے بیشتر ایسے کوتاہ نظر بھی ہیں کہ جو اپنی ہی ذات کے منکر بھی ہیں اور ایسے افراد جو اپنے منکر ہیں تو وہ اپنے خالق کا اقرار کیسے کر سکتے ہیں بلکہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اس بات کے مرتکب ہو گئے ہیں نظم "کوہِ ندا" میں بھی شاعر بہت خوبصورت انداز میں ایسے افراد کی سوچ کو بیان کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

کوہِ ندا

"بتا مجھ کو

کہ ہے بھی یا نہیں ہے تو

اگر تو ہے

تو تجھ کو اپنے ہونے سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے

مگر وہ جن کی عمریں ڈھل گئیں تیرے تعاقب میں

بھلا کر اپنی ہستی کو وہ پل پل سوچنے والے

کہ گر تو ہے تو کیسا ہے، کس لیے، کب سے ہے

کب تک اور کہاں ہے تو

حدودِ وقت سے باہر کہ لمحوں میں نہاں ہے تو"

(مدارِ نارسائی میں، صفحہ: ۴۴۳)

کہ پہلے انسان پوچھ رہا ہے کہ اے خدا تو ہے؟ اور اگر ہے تو کہاں ہے؟ کیا تجھے بھی اپنے ہونے یا نہ ہونے سے فرق پڑتا ہے اور وہ لوگ جو تمام عمر اسی سعی میں سرگرداں رہے کہ وہ تجھے ڈھونڈ سکیں، پاسکیں، تیرا سراغ انہیں مل جائے وہ تو ختم ہو گئے مگر تجھ تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ اور انہیں ان سوالات کا جواب ابھی تک نہیں ملا کہ تو ہے تو کیسا ہے؟ تو کیوں کس لیے ہے؟ اور تو کب سے موجود ہے؟ اور ہاں کب تک رہے

گا، کیا تجھے کوئی فنا ہے؟ اور پھر یہ کہ تو کہاں موجود ہے؟ یہ اور اس جیسے بے شمار سوالات انسانوں کے اذہان میں وارد ہوتے رہے مگر عام اور کوتاہ نظر انسان ان کا جواب تو کیا جواب کا عشر عشر بھی حاصل نہیں کر سکے۔ آگے وہ اسی نظم میں چل کر کہتے ہیں۔

"نہیں تو کیوں نہیں ہے تو"

تجھے اپنے نہ ہونے کی بھی کب کوئی پریشانی

مگر وہ خوش گماں جن کا یقین ہے تو

وہ کعبہ خوش نما مندر کلیسا اور دل

جن کا مکین ہے تو

گماں کے پار، رہ کر بھی رگِ جاں سے قریں ہے تو

جو بس حسن تصور سے سمجھتے ہیں

تصور سے حسیں ہے تو

بتا ان کو

نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے تو"

کسی نے پورے زناٹے کا سناٹا

سماعت کی لرزتی دف پہ دے مارا

مری خاطر بھلا اتنے تجسس کا تردد کیوں

مرے ہونے نہ ہونے سے کسی کو کیا پریشانی

یہ میری ہست کے قائل یہ اپنی ذات کے کافر

بتاؤ اپنے ہونے پر کہاں ایمان رکھتے ہیں

جو خود اپنے نشان سے اجنبی ٹھہرے

وہ میری بے نشانی کو کہاں پہچان سکتے ہیں

(مدارِ نارسائی میں، ص: ۴۴۴)

اسی طرح وہ اپنی ایک نظم "گنتی" میں بھی اللہ کی بے انت وسعتوں کے حوالے سے کچھ یوں رقمطراز

ہیں:

گنتی

یہ آٹھ پہروں شمار کرنا
کہ سات رنگوں کے اس نگر میں

جہات چھ ہیں

حواس خمسہ

چہار موسم

زماں ثلاثہ

جہان دو ہیں

خدائے واحد!

یہ تیری بے انت وسعتوں کے سفر پہ نکلے ہوئے مسافر
عجب گنتی میں کھو گئے ہیں

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۲۶۴)

اس طرح سید مبارک شاہ اس حقیقت پہ بات کرتے ہیں کہ انسان اس حقیقت تک رسائی کے حصول سے نہ صرف یہ کہ عاجز ہے بلکہ وہ تو دیگر فضولیات میں کھو جاتا ہے اور وہ تو صرف ظاہری اور عددی حساب کتاب میں ہی الجھ کر رہ جاتا ہے اور عرفان ذات الہی کے حصول کے لیے تو اسے عرفان ذات کے بعد ہی شائد کچھ مل جائے بس ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ خود کو پہچانے اپنے مقصد حیات کو پہچانے تو تب ہی اسے کامیابی مل سکتی ہے۔

۶۔ بے ثباتی:

آج اگر ہم اپنے ماحول پر اور ارد گرد کے ماحول کا مشاہدہ کریں تو حقیقت ہمارے سامنے آکھڑی ہوگی وہ یہ ہے کہ یہ سب مایا ہے۔ سب کی حقیقت ہیچ ہے سب فنا ہے بقاء، دوام اور ثبات صرف اور صرف اسی واحد و یکتا ولا ثانی ذات کے حصے میں آیا جو صرف ایک ہے اور وہ رب ہے وہ حی ہے وہ قیوم ہے وہ ہمیشہ سے ہے اور رہے گا۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ انسان فانی ہے بے ثبات ہے آج ہم اس دنیا میں موجود ہیں، اس محفل کے روح رواں ہیں تحریک میں ہیں لیکن چند ثانیے بعد ہم اپنا نام مقام و مرتبہ یکسر کھو بیٹھے گے۔ ہمارا اسم ذات بدل کر لاش، نعش یا مردہ یا میت ہو جائے گا۔ ہمارا مقام، گھریا کوٹھی یا محل کی بجائے قبر کی اندھیری کوٹھری ہو جائے گا۔ اور دن کی روشنی میں آنکھیں کھولنے کی بجائے قبر کی سیاہ رات، تاریکیاں اور تنہائیاں ہمارا مقدر ہو جائیں گی۔ اس قدر بے ثبات ہے یہ حیات اور اس کے ہنگامے اس قدر ناپائدار ہیں یہ دنیاوی اشیاء اور تعیشات کہ انسان ورطہ حیرت میں غرق ہو کر پریشان ہو جاتا ہے۔

اردو شاعری میں اس موضوع پر بھی شعراء نے خامہ فرسائی کی ہے۔ انہیں روایت کا تتبع کرتے ہوئے سید مبارک شاہ نے بھی اس موضوع کو کمال درجے پر پہنچا کر شاعری کی ہے۔ ان کے کلام میں ہمیں اس موضوع پر بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ سید مبارک شاہ کی کتاب "جنگل کے گمان" میں شامل نظم "ڈر" جو ایک مختصر نظم ہے اس میں انہوں نے اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے، وہ کچھ یوں رقمطراز ہیں:

ڈر

لمحہ لمحہ ڈس رہا ہے ایک ہی لمحے کا ڈر
زندگی کو مار دے گا ایک مرنے کا ڈر
اتنے تھوڑے وقت میں کیا کیا نہ کچھ کرنے کی دھن
اتنی لمبی عمر میں کچھ بھی نہ کر سکنے کا ڈر

(جنگل گمان کے، ص: ۶۸)

اس نظم کے پہلے حصے میں وہ کہتے ہیں کہ انسان ہر لمحہ اسی ڈر میں مبتلا ہے کہ کب زندگی کا یہ سورج ڈھلے اور شام ہو جائے اور کب یہ روشنی تاریکی میں بدلے؟ اسی ڈر اور خوف کے ماحول میں وہ

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یو نہیں تمام ہوتی ہے

کے مصداق لا حاصل اور بے مقصد وقت گزارتا جاتا ہے بلکہ وہ پریشان رہتا ہے کہ کب اور کس لمحے وہ پنچہ موت میں جکڑا جائے اور یہی سوچ اسے خوشی منانے نہیں دیتی اور وہ زندگی اور اس کی رعنائیوں سے

گریزاں رہتا ہے اور بظاہر تو یہ زندگی بڑی طویل نظر آتی ہے مگر موت کے خوف سے بہت سے ایسے کام جو انسان کرنا چاہتا ہے وہ نہیں کر پاتا۔ اگلے ہی لمحے وہ خود کچھ یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

ایک نقطہ نظر

جو وقت ہونا بود کبھی

جو وقت نہیں موجود ابھی

کیوں رہ رہ اس کو یاد کریں

اور اپنے زندہ پل بھر کو برباد کریں

آزاد کریں آزار سے اپنے جینے کو

اپنے آپ سے بھر لیں اپنے سینے کو

(جنگل گمان کے، صفحہ: ۷۰)

یعنی انسان بہت کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے ذہن سے موت کے خیال کو ٹال دے، یکسر نکال دے اور کچھ لمحے جی لے، خوشی کو محسوس کرے مگر بے ثباتی کا خوف جو اس کے ذہن و قلب پر بسیرا کیے ہوئے ہے وہ اسے ایسا کرنے نہیں دیتا۔ وہ انسانی زندگی اور عرصہ حیات کو برف کے جزیرے اور وقت کو آگ کا سمندر کہتے ہیں۔ انکی نظم "اعتبار" میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

اعتبار

وقت کو جو دیکھو تو

آگ کا سمندر ہے

آگ کے سمندر میں

یہ جو اپنی عمریں ہیں

برف کے جزیروں پر

ہم جو اپنے پیاروں کا

انتظار کرتے ہیں

ہائے کتنے پاگل ہیں

آگ کے سمندر کا

اعتبار کرتے ہیں

(جنگل گمان کے، صفحہ: ۱۰۷)

گویا وقت سب کچھ راکھ کر دے گا، حیات اور حسنِ حیات سب اس کے رحم و کرم پر ہے اور انسان غلط فہمی میں غطاں ہے وہ اپنے آنے والے وقت سے بے خبر ہے وہ نظم "برزخ" میں یوں رقمطراز ہیں:

برزخ

ہمیں تھے جن پہ حشر بھی

بدل کے بھیس وقت کا گزر گیا

تو ہم کسی کے دھیان میں کھڑے رہے

ہم ایسے بے نصیب تھے

جو عمر اور زندگی کے درمیان

برزخ گمان میں پڑے رہے

(ہم اپنی ذات کے کافر، صفحہ: ۲۰۷)

سید مبارک شاہ اس کیفیتِ غلط فہمی سے اتنا کر بیزاری سے کہتے ہیں کہ ہم کہاں جائیں اس صورتحال سے کیسے پناہ حاصل کریں اور اس جہان کی بے ثباتی کو بیان کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

ایک ناگفتہ دُعا

(نذر اقبال)

اجاڑ ہے جہانِ رنگ و بو جہاں

نہ بوئے رنگِ آرزو، نہ رنگِ بوئے جستجو

یہ قیدِ بے کنار بھی مرے جنوں پہ تنگ ہے

نہ زندگی کی آرزو، نہ موت کی اُمنگ ہے

نہیں ہے اس جمود کو مطابقت، تری مری سرشت سے

مرے خدا! نجات دے تو کون دے

ہمیں عذابِ دوزخ و بہشت سے

(ہم اپنی ذات کے کافر، صفحہ: ۲۱۷)

سید مبارک شاہ طنزیہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو جو یہ حیات ملی ہے یہ برائے ممت ملی ہے زندگی موت دینے کے لیے دی گئی ہے اس حقیقت کو وہ بیان کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

شبِ آخر کا نوحہ

جو قیدِ عمر کٹ جائے

تو جینے کے سبھی ملزم

سزائے موت پاتے ہیں

ہمارے ہم نفس بھی زیست کی مہلت

برائے موت پاتے ہیں

(جنگل گمان کے، صفحہ: ۱۶۲)

گویا بے ثباتی پہلے ہی مقدر میں تحریر کی جا چکی ہے اور یہ زندگی ایک مسلسل سفر ہے جسے کرتے رہنا اور جس کو اختیار کرنا ہماری مجبوری ہے اس سے فرار ممکن نہیں "مفر کی بات مت کرنا" اس میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

مفر کی بات مت کرنا

مسافت سے مفر ممکن نہیں کوئی

مگر آنکھوں سے یہ پامال منظر کب تلک دیکھیں

چلو ان دائروں کو آج قدموں سے جھٹک کر

اپنے نادیدہ جہانِ زندگی کی اک جھلک دیکھیں

(ہم اپنی ذات کے کافر، صفحہ: ۲۲۷)

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ انسانی زندگی بے ثبات ہے پر کائنات کی ہر شے اور ہر ذی روح ایک نہ ایک دن واپسی کے سفر پہ عازم سفر ہوگی اور ہر ذی روح نے موت کا مزہ چکھنا ہے تو ایسے میں جو لوگ اس حقیقت کو فراموش کر دیں انہیں ہم سادہ لوح ہی کہہ سکتے ہیں یا غافلِ حقیقت۔ سید مبارک شاہ نے اس بات کو سمجھتے ہوئے الفاظ کے قالب میں کچھ یوں ڈھالا ہے:

ایک لرزیدہ دعا

کوئی ماں جب یہ کہتی ہے

خدایا! میرے بچوں کو قیامت تک سلامت رکھ

تو بچے مسکراتے ہیں

قیامت تک سلامت کون رہتا ہے

(ہم اپنی ذات کے کافر، صفحہ: ۲۷۰)

سید مبارک شاہ نظم "ایک مسافت نامہ" میں یوں رقمطراز ہیں:

"چل کہ تیرے سامنے

بانہوں کو پھیلائے کھڑے ہیں رفتگاں

اور عقب میں

صورتِ گردِ سفر ہے لشکرِ آسندگاں

چل کہ اس دشتِ فنا کے اس طرف تو جاوداں"

(مدارِ نارسائی میں، صفحہ: ۴۲۳)

یعنی موت کے بعد جو زندگی ابدی ہے اور ختم نہ ہونے والی ہے وہ اس جہان میں نہیں بلکہ دوسرے

جہان میں ہے جہاں بہت سے وہ لوگ بھی ہیں جو تم سے قبل جا چکے ہیں اور وہ بھی منتظر ہیں جو ابھی اس بے

ثبات دنیا کی سیر کو آئیں گے۔ نظم "پڑتال" میں سید مبارک شاہ یوں رقمطراز ہیں:

پڑتال

ساری عمر کے سارے دکھ اور سارے سکھ اکٹھے کر کے

دکھ سکھ سے تفریق کرو تو

حاصل زندہ رہنا ہو گا

حاصل جو اثبات نہیں ہے

پھر بھی کوئی بات نہیں ہے

جس نے کھیل سمجھ کر ہارا

اس کے حصے مات نہیں ہے۔

(مدارِ نارسائی میں، صفحہ: ۴۲۷)

سید مبارک زندگی کے لیے لفظ "کھیل" استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک کھیل ہے اس دنیا میں آباد ہونا اور پھر جانا جس نے اسے سنجیدگی سے لیا وہ ہار جائے گا اور دکھی بھی ہو گا اسے یہ دنیا اور یہ زندگی چھوڑ کر جانے کا دکھ بھی زیادہ ہو گا اس کے برعکس وہ شخص جو اسے کھیل تماشا سمجھے گا وہ فائدے میں رہے گا۔ سید مبارک شاہ زندگی کی بے ثباتی کے پیشِ نظر یہ دعوت دیتے ہیں کہ جب یہ ہے یہی بے وفا تو اس کے ہر لمحے سے فائدہ اور حظ اٹھانی چاہیے اور اسے رائیگاں نہیں گزارنا چاہیے یہ ایک مارِ ملتی ہے اس سے بھرپور لطف اٹھانا چاہیے:

تاسف

اپنے حصے کی ہر رت گئی رائیگاں

وقت کے پیڑ سے

وقت پر اک ثمر بھی اتارا نہیں

ہم نے کٹتے ہوئے عمر کاٹی مگر

ایک پل زندگی کا گزارا نہیں

(مدارِ نارسائی میں، صفحہ: ۴۴۸)

۷۔ منصور حلاج:

جستجو آدم ایک ایسا معاملہ ہے کہ ہر کوئی اسی میں ہے کہ کامل انسان اسے مل جائے مگر یہ کام کافی حد تک محسوسات سے تعلق رکھتا ہے کسی شخص کے کاملیت کے معیار اپنے ہوئے ہیں سید مبارک شاہ تلاشِ مردِ کامل کے سلسلے میں وسیعِ المشرقی کے حامل ہیں انہوں نے امتیازِ رنگ و نسل اور تعصبِ مذہب و مشرب سے بالاتر ہو کر انتہائی بے نیازی سے کام لیا ہے۔ سید مبارک شاہ کی تاریخِ تمام محترم و مکرم ہستیوں سے متاثر نظر آتے ہیں وہ انبیاء کے ساتھ ساتھ امامؑ اور منصور حلاج سے بھی بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ گوتم بدھ، سقراط زرتشت اور کنفیو شیئس بھی ان کے ہاں کافی مکرم و محترم ہیں۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ یہ

تمام ہستیاں وہ ہیں جن سے انہوں نے اثر لیا انہوں نے نظم "حریص" میں سقراط کے حوالے سے بات کی کہ کیسے وہ عوام کے وسیع تر مفاد کی خاطر زیر کا پیالہ آرام سے پی لیتا ہے۔

اسی طرح انہوں نے "برگد کی دھوپ میں" نظم گوتم بدھ کے حوالے سے لکھی ہے یہ ان کی شاعری میں ایک بہترین تاثر کا نتیجہ ہی کہی جاسکتی ہے۔

برگد کی دھوپ میں

اے سدھارتا!

یہ نہ جانے کتنے سدھارتاؤں کی بھیڑ ہے

ترے سامنے

جنہیں برگدوں کا سکوت کب سے بلا رہا ہے مگر انہیں

کوئی راستہ کہیں بھاگنے کو ملا نہیں

کہاں جائیں اور کسے چھوڑ کر

جنہیں اپنا آپ بھی اس جہاں میں تیاگنے کو ملا نہیں

مرے قبلائے فریب!

تو ہنوز اپنے مراقبے سے اٹھا نہیں

(مدارِ نارسائی میں، ص: ۵۱۳)

سقراط کے حوالے سے انہوں نے جیسے شاعری کی ہے اس سے قاری کو بخوبی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہیں اُن سے محبت کے علاوہ عقیدت بھی بلا درجے کی ہے۔ اس کے لیے نظم ملاحظہ ہو:

ایک سوال

پھر تم نے خاموشی سن کر

زہریلا اور مر جانے کو مار دیا تھا

اب اس قید سے باہر آ کر

بستی بستی لمحہ لمحہ دیں بدلتے بھیس بدلتے پھرتے ہو تم

کون تمہیں پہچان سکے گا

لیکن کوئی جان بھی تو لے
کیا پوچھے گا؟

اسی طرح ان کی نظم "لکھنے والو کیا لکھو گے" میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

بولنے والو! کیا بولو گے
سارے لفظ ستائش والے
ترکیبیں تحسین کی ساری
اور عقیدت کے سب لہجے
جس کے سامنے سناٹا ہوں

کیا اس کی توصیف کرو گے؟
جس کی تعریف پس یہی ہے
وہ ایسی تعبیر تھا جس کا
خواب خدا نے تکتے تکتے
اپنے آپ سے کن کہہ ڈالا

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۲۶۸)

اسی طرح وہ اپنی نظم "معذرت" میں بھی سقراط سے یہ عہد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

مگر تیرے عرفانِ علم و عمل کو
جہالت سے مغلوب ہونے نہ دیں گے
تیرے عجز کے دبدبے کو
رعونت سے مرعوب ہونے نہ دیں گے
مسیحا کو مجذوب ہونے نہ دیں گے

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۲۶۹)

اسی طرح امام حسینؑ کا حوالہ بھی کئی اشعار اور نظموں ملتا ہے۔ نظم "مرثیہ" ملاحظہ ہو:

مرثیہ

کوئی ان کے نام کا مرثیہ مرے شاعر و!

مرے عہد کے وہ حسین جو

یہیں سر زمین منافقت پہ

مقیم خیمہ صدق ہیں

اسی کربلائے حیات پر

جو نہ بک سکے

کبھی جبر والوں کے بات پر

کہ جو مصلحت کے فرات پر

رہے تشنہ لب کہ یہ تشنگی

ابھی آنے والی تمام نسلوں پہ قرض ہے

جو ہر ایک حسین کا فرض ہے

(جنگل گمان کے، ص: ۱۵۹)

تاہم اگر سید مبارک شاہ کے کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ تاریخ کی واحد شخصیت جن کا سید مبارک شاہ پر سب سے زیادہ اثر پڑا وہ منصور حلاج ہے۔ بلکہ اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ سید مبارک شاہ کی شاعری زیادہ تر قرآن سے متاثر ہے اور دوسرے نمبر پر منصور حلاج سے اور یہ اثر تصوف کے حوالے سے بھی ہے کلام اور شاعری کے حوالے سے بھی سید مبارک شاہ کی نظم ملاحظہ ہو:

حسین ابن منصور کی ایک نظم

جو کل من علیہا فان کہتا ہے

وہ رہتا ہے

تو دیکھے گا

پہاڑوں سے سمندر کو

جو دریا جذب کرتا ہے

سمندر میں

وہی مجذوب دریا آن بہتا ہے

جو کل من علیہا فان کہتا ہے

(مدار نارسائی میں، ص: ۳۷۴)

اسی طرح وہ نظم "زمانے کی تاریخ شاہد رہے گی" میں حسین ابن منصور کا ذکر بہت خوبصورت انداز

میں کرتے ہیں:

زمانے کی تاریخ شاہد رہے گی

زمانے کی تاریخ شاہد رہے گی

کہ جب بھی کسی نے خدا کے حسد میں

خدائی کا دعویٰ کیا ہے

تو ابن الزماں

اس کی تائید میں

اس کے دربار میں سر بسجده ہوئے

ان اطاعت سرشتوں نے

شداد و نمرود و فرعون کو

ان کی نوزائیدہ تمکنت دیکھ کر

آپ سجدہ کیا

اور پھر اس کی دعوت زمانے کو دی

اور زمانہ خدا ساز لوگوں کی ترغیب سے

کب نہ راغب ہوا

مگر جب خدا خود زمیں پر اتر کر

حسین ابن منصور کو اوڑھ کر

منکشف ہو گیا۔

تو زمانے کے بیٹے اکٹھے ہوئے

اور سوچا کہ آخر خدا

تمکنت سے تہی اور زمیں مرتبت کس طرح ہو گیا؟

اور ایسے خدا سے تعلق کا کیا فائدہ؟

جو زمانے کی ساری ملامت کو اوڑھے ہوئے

در بدر ہو گیا

بے اماں! سنگِ دستِ جہاں کا ہدف!

زمانے کی تاریخ شاہد رہے گی

یہ فتویٰ خدا ساز لوگوں نے صادر کیا تھا

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۲۲۲-۲۲۱)

سید مبارک شاہ کے کلام میں حسین ابن منصور حلاج کے حوالے سے ایک خوبصورت نظم "نہ جانے
اسے کس نے آواز دی تھی" جس میں ان کے حوالے سے تقریباً تمام تر حقائق کو ایسے سمیٹا گیا جیسے کوزے میں
دریا کو بند کر دیا جائے ملاحظہ ہو۔

حسین ابن منصور

نہ جانے اسے کس نے آواز دی تھی

وہ جب اپنے گھر سے روانہ ہوا تھا

تو دل کو جکڑتی نگاہِ پدر

اپنے صحرا کی دامن پکڑتی ہوا

اور پاؤں کو چھوتی ہوئی ریت سے

اس نے وعدہ کیا تھا

مجھے تم کسی کے عقب میں نہیں پاؤ گے

اور مری گرد کوئی نہیں پاسکے گا

نہ جانے اُسے کس نے آواز دی تھی
جو صحرا کے دامن سے باہر نکل کر بھی
دیوارِ مکاں سے سر پھوڑتا تھا
مسافت کی پیمائشیں کرنے والا
دو حرقہ کی بستی میں تستر کی منزل پہ
کیا سانس لیتا

جنید اس کی حالت سے کب بے خبر تھا
مگرمیوں سر راہ دیکھا تو ٹوکا
"حسین ابن منصور! تم جانتے ہو
تصوفِ طبیبوں کا نسخہ نہیں ہے"
جو اباً وہ کیا اس سے کہتا
کہ نسخے طبیب اپنے سینوں میں دفنائے پھرتے ہیں
بازار میں بس دوا بیچتے ہیں

جنید اس کی خاموشیاں سُن کے بولا
"تمہیں رازداری کا مطلب پتا ہے!
تم ابلیس کی راہ پر چل پڑے ہو
اور ابلیس کی کوئی منزل نہیں تھی"
"نہیں یہ عزازیل سے اتنی نفرت!
جنید آپ جیسوں کو شایاں نہیں ہے
اسے منزلوں کی طلب ہی کہاں تھی
رضا اور مشیت کے دو راستے تھے
اسے دونوں جانب سے آواز آئی
تو اُس نے مشیت کا راستہ چنا تھا

پتا ہے!

اسے رازداری کا مطلب پتا تھا"

"عزیز کی شان میں یہ قصیدہ تمہی کو مبارک

مگر یہ جسارت کہ قرآن کی آیتوں کے جوابات لکھو"

"تو کیا خط کو پڑھ کر جواب نہ لکھتا"

"حسین ابن منصور!"

تم ایک دن خشک لکڑی کو رنگیں کرو گے"

وہ سر کو جھکائے ہوئے مسکراتا ہوا اٹھ پڑا تو

جنید اس کو حسرت سے بس دیکھتا رہ گیا

اور شبلی کا دیوانہ پن رو پڑا تھا

مگر جب انا الحق انا الحق کی آواز

بغداد کے آسمان کو دھنکنے لگی

اور قلوب اولی الامر متلا گئے

تب وہ صحرا بدرنگ و تاریک زنداں میں لایا گیا

قید خانے کی تاریک و ترسیر ہیوں سے پھسلتے ہوئے

اس نے اپنے لرزتے ہوئے ناتواں ہاتھ کو

جب سپاہی کے شانے پہ رکھا

تو پر بت پہ پورا فلک گر پڑا

ریزہ ریزہ سپاہی نے خود کو اکھٹا کیا اور کہنے لگا

"آپ چاہیں تو میں قید خانے کے در کھول دوں"

مگر اس نے آہستگی سے کہا تھا

"نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے

میں چاہوں تو دیوارِ زنداں ہٹا دوں

تمہیں کیا بتاؤں

کہ دیوار کھلنے سے اس قید خانے کی وسعت بڑھے گی
مجھے حدِ طاسین سے تم نکالو گے کیسے؟
بتاؤ تو سقراط کس در سے باہر گیا تھا!"

اسی قید خانے سے دربار میں جب وہ لایا گیا
تو تکلم کا لہجہ بڑا کھر درا تھا
اُسے دیکھ کر ابنِ عباس گر جا
"حسین ابنِ منصور! تو حاکم وقت کے سامنے ہے"
"مرے سامنے وقت رہتا نہیں ہے"
تو پھر اس کا حاکم!"

"مجوسی کے پوتے! جو لاہے کے بیٹے"
نبوت کے دعوے سے باہر نکل کر خدا بن گیا ہے
ترے قتل نامے پہ قاضی کی مہریں مرے ہاتھ میں ہیں
مجھے تیری گستاخ دیوانگی کی قسم ہے
تو حلاج کا لختِ جاں ہے تو میں بھی
تجھے سولیوں پر دھنک کر
ترے ریشے ریشے سے جاں نوچ لوں گا"

مگر جب بدن منہدم ہو گیا
اور حسین ابنِ منصور اٹھا
تو قدموں سے راہیں سرکنے لگیں
اس کے پاؤں سے رفتار کھلنے لگی تھی
"انا الحق، انا الحق، انا الحق، انا الحق"
نہ جانے اُسے کس نے آواز دی تھی

(مدارنارسانی میں، ص ۱۱-۵۰۷)

اس نظم میں سید مبارک شاہ نے منصور حلاج کا سوانحی خاکہ پیش کیا ہے۔ اور دوسری جانب تاریخ تصوف کے مختلف مشارب اور تاریخ اسلام کی متحارب قوتوں کا بہترین تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر عرفان نے سید مبارک شاہ کی شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور یوں رقمطراز ہیں:

"ان کے اکثر اشعار نے مجھے چونکا کر بلکہ ہلا کر رکھ دیا۔ ان کی شاعری میں مجھے اپنے دے، تلملاتے ہوئے خیالات کا پر تو نظر آیا۔ وہ جو میں سوچتے ہوئے بھی گھبراتا تھا وہ ان کے ہاں مسطور بلکہ منظوم موجود تھا۔ ان کا شعر

بتا اُن اہل ایماں کی سزا رکھی ہے کیا تو نے
خُدا وندا جو تجھ کو احتیاطاً مان لیتے ہیں

تو میر اور زبان بن گیا۔" (۱۲)

۸۔ حساسیت اور معاشی بے حسی:

سید مبارک شاہ جیسے حساس فرد کا معاشرے کی بے حسی اور اس میں موجود عدم مساوات، ظلم، جبر، بے حسی اور نا انصافی پر کڑھنا ایک فطری امر ہے وہ انسانی حقوق کی پامالی سے دکھی اور رنجیدہ نظر آتے ہیں اور جابجا اپنے جذبات کا اظہار اشعار کی صورت میں کرتے ہیں۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ کوئی بھی زندہ اور ذی شعور بندہ اپنے ماحول اور گرد و پیش میں ہونے والے واقعات سے لا تعلق نہیں رہ سکتا۔ اس کی مثال سید مبارک شاہ کے کلام میں ہمیں بخوبی ملتی ہے:

جشن

جشن کا روز ہے

کتنا بھرپور ہے اہتمام طرب

مست بیٹھے ہوئے ہیں شیوخ عرب

جن کی آغوش میں

زندگی کی جواں دلہنیں جلوہ گر

جن کا زور حشم عیش کا سوداگر

عیش کے سوداگر

اک انوکھے تماشے کے ہیں منتظر
مست اونٹوں کی پشتوں پہ باندھے گئے
چند معصوم بچے بلکتے ہوئے

جن کی وحشت سے

گھبرا کے صحراؤں کے جانور
اس قدر دوڑتے ہیں کہ ہو
دشت والوں کا خوں تیز تر

اور پھر قہقہوں کی صدا میں سدا
ڈوب جاتی ہیں معصوم چیخیں مگر
دشت، دہشت زدہ

سوچتا ہے کہ تھے کس کے لخت جگر
یہ غیر الوطن، وارثانِ ارم!
بک گئے بے خبر اہل زر کے لئے
دربدر ہو گئے اپنے گھر کے لئے

کس نے ان کے لبوں سے ہنسی چھین لی
دامنِ عمر سے زندگی چھین لی

(جنگل گمان کے، ص: ۴۶-۱۴۵)

مذکورہ بالا نظم میں انسانیت کی تذلیل کی جو تصویر دکھائی گئی ہے وہ بہت فنیج ہے۔ عرب کے شیوخ
غریب ممالک کے لوگوں کے بچوں کو خرید کر محض تفریح طبع کے لیے موت کے منہ میں پہنچا دیتے ہیں اور
ایک غیر انسانی بے رحم طریقے انہیں کھیل کا وہ حصہ بنا کر ان کی زندگی سے مکروہ اندازہ میں کھلواڑ کرتے ہیں

، اسی ناصافی اور بے رحمی اور بے حسی کو مذکورہ بالا نظم میں بہت مؤثر انداز میں سید مبارک شاہ اشعار کے قالب میں ڈھالتے نظر آتے ہیں۔

سید مبارک شاہ کے کلام میں ایک اور نظم "بلا حواز" میں بھی معاشرتی بے حسی کو پیش کیا ہے کہ کیسے مجبوری کے مارے ننھے پھولوں جیسے ہاتھ مشقت کی چکی میں شب و روز پستے ہیں اور یہ پھول روندے جاتے ہیں۔

بلا حواز

کھر درے قدموں کے نیچے فرشِ مخمل کی لرزتی سکیاں ہیں
نرم ریشوں کے تڑپتے لمس کا مصرف ہی کیا ہے؟
گدگد اہٹ کے سوا کچھ بھی نہیں
سوت کے تاروں سے آخر کس نے دیکھی ہے
گداز دستِ ریشم کی کشید
دستِ ریشم جو نظر کی دھول سے ہودا غدار
کس نے دیکھا پھول جیسے ہاتھ کیسے
کھر درے دھاگوں سے الجھے اور پھر مر جھاگئے
کارخانہ دار کی مجبوریاں بھی ٹھیک ہیں اپنی جگہ
ہے کہاں ان نرم پوروں کا کوئی نعم البدل!
پھر یہ مخمل کے تڑپتے تلملاتے نرم ریشے
کس بنا پر مانگتے ہیں
ریشمی ہاتھوں پہ قسمت کی لکیروں میں دراڑوں کا خراج
کچھ نہیں ہے کچھ نہیں غالیچہ بے جاں کی وحشت کا علاج

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص ۳۱۸)

ان کے کلام میں یہ نظمیں بہت خوبصورت مثالیں ہیں اس صدائے احتجاج کی جو انہوں نے معاشرے کے عیاش اور اعلیٰ طبقے کی عیش و عشرت کے لیے غریبوں کو بے دردی سے استعمال کے خلاف اٹھائی۔ اس عشرت کو پورا پورا حاصل کرنے کے کھیل میں یہ عیاش طبقہ غریب طبقے کی بنیادی ضرورتوں سے

بھی انہیں محروم کرتا چلا جاتا ہے۔ سید مبارک شاہ نظم "المہ ترکیف" میں ان مشکلات حالات اور معاشرے میں پھیلی بد امنی و قتل و خون ریزی سے امان کی دعا کرتے ہیں اور یوں رقمطراز ہیں:

المہ ترکیف

رب کعبہ! تجھے تیرے گھر کی قسم

جو سلامت رہا اور سلامت رہے

تاقیامت رہے

میرے برباد شہروں کی فریاد سن

ابرہہ کا جہاں لشکرِ فیل ہے

ہم کو پھر انتظارِ ابابیل ہے

(جنگل گمان کے، ص: ۱۱۹)

وطن عزیز میں پھیلی بد امنی اور شہروں کی تخریب سے ہر فرد کی طرح شعراء بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے۔ کراچی جسے روشینوں کا شہر کیا جاتا تھا اس کے بگڑتے ہوئے حالات، بد امنی اور بربادی کو سید مبارک شاہ نے بہت مؤثر انداز میں موضوع بحث بناتے ہوئے اس شہر کی اداسی، خاموشی اور تاریکی کو موضوع بحث بنایا، وہ یوں رقمطراز ہیں:

اے شہر چراغاں

(کراچی کے لیے ایک نظم)

اے شہر چراغاں! یہ تیرے بجھتے چراغوں کی اداسی

سو جاتے ہیں دن ڈھلتے ہی کیسے ترے باسی

ہر سمت یہ پھیلے ہوئے بے نور چراغوں کے اندھیرے

خوابیدہ ہیں جن میں کہ ترے رخ کے سویرے

یوں تیرگی پھیلی ہے کہ

امید کا سہا ہوا جگنو بھی چمکتا ہے

تو نظروں میں لپکتے ہیں اندھیرے

طوفان ہے صرصر کا، جو انداز صالوٹ گیا ہے
 یا شعلہ دوزخ ہے کہ جو نور تیرالوٹ گیا ہے
 اے شہر دھنک رنگ ہمیں یاد ہے اب تک
 راتوں کا سویرا ترا اسلوب رہا ہے
 لیکن یہ سرشام ہی کیسی ہے ادا سی
 خورشید جو ڈوبا ہے تو دل ڈوب رہا ہے

(جنگل گمان کے، ص: ۱۲۳)

سید مبارک شاہ تمام تر مصائب اور معاشرے کی بد صورتیوں کے باوجود اپنے تئیں درست راہ پر
 گامزن رہے اور کاروبار حیات میں آگے بڑھتے رہے۔ اپنے فرائض منصبی بھی انتہائی دلچسپی، دلجمعی اور
 ایمانداری سے سرانجام دیتے رہے اور اس دوران اپنی طبیعت کے مطابق تخلیقی کام بھی شاعری کی صورت میں
 کرتے رہے بلکہ دوران کاروبار حیات پیش آنے والے تجربات کو جمالیات کے جس اچھوتے، منفرد اور
 نکھرے ہوئے سانچے میں ڈھالا وہ لاجواب اور بے نظیر ہے ان کی نمائندہ نظمیں اس حوالے سے "ڈکٹیشن"
 بیورو کریسی "اور تیس جون" ہیں۔

تیس جون

آج شب سب دفاتر کشادہ رہیں
 آج سونا نہیں
 جس قدر جس کو تفویض سرکار ہے
 رات بارہ بجے تک تصرف میں ہے
 ہاں ابھی وقت ہے

 جون کی آخری شب کڑا وقت ہے
 پر بڑا وقت ہے
 اس کی تقویم تو سب کو معلوم ہے

دفترِ عمر میں
کتنا عرصہ کتنا عرصہ کٹے
کس کو معلوم ہے

(مدارِ نارسائی میں، ص: ۴۷۴)

سید مبارک شاہ کے کلام میں ہمیں یہ بات نظر آتی ہے کہ انہوں نے نامساعد حالات سے ہارنا نہیں سیکھا بلکہ زندگی کے سفر کو آگے جاری رکھتے ہوئے ان حالات سے لڑتے رہے اور علان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ چاہے حیات جہنم نما جہان زشت بن جائے لیکن میرے اندر کے جو حسین جنت قائم ہے میں اُس کو فراموش نہیں کروں گا۔ وہ یوں رقمطراز ہیں:

ہمیں وہ ذائقہ چکھ کر بتانا ہے
جو چکھیں تو بتایا جا نہیں سکتا
مگر ہم نے بتانا ہے

(ص: ۳۹۸، ۳۹۹)

کہ لمحے جاں کنی کے زندگی پر کیسے بیتے ہیں
تو آؤ مرگِ دوراں میں ابھی کچھ دیر جیتے ہیں

(مدارِ نارسائی میں، ص: ۳۹۸)

میری رائے میں وہ نہ تو حسین خواب سیکھنے سے روکتے ہیں اور نہ ہی فتنج حقائق سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ مردانہ وار ان کا مقابلہ کرتے ہیں اور وہ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے ان فتنج اشیاء کو نہ خود دیکھیں گے بلکہ بصیرت کو عام کر کے افراد معاشرہ کو بھی ان سے واقف کرانا انہوں نے اپنے ذمہ واجب کر لیا ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ فقیر احمد، پروفیسر، "ہماری شاعری"، پاپولر پبلیکیشننگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۳۔
- ۲۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، "کشاف تنقیدی اصطلاحات"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۱۹۹۔
- ۳۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، "اردو شاعری کا ارتقاء"، الو قاری پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۷ء، ص ۱۷۱۔
- ۴۔ وزیر آغا ڈاکٹر، "اردو شاعری کا مزاج"، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول، ۲۰۰۸ء، ص ۲۸۵۔
- ۵۔ عطش درانی، ڈاکٹر، "اردو اصناف کی مختصر تاریخ"، میری لائبریری، طبع دوم، ۲۰۰۸ء، ص ۲۵۔
- ۶۔ انور سدید ڈاکٹر، "اردو ادب کی تحریکیں"، انجمن اردو پاکستان کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۴۲۹۔
- ۷۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستان کی نئی نظم پر گفتگو مشہور پاکستان ادب جلد اول۔ فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج راولپنڈی، ۱۹۸۱ء، ص ۳۴۔
- ۸۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستان کی نئی نظم پر گفتگو مشہور پاکستان ادب جلد اول۔ فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج راولپنڈی، ۱۹۸۱ء، ص ۳۴۔
- ۹۔ رفیع الدین اشفاق، سید، "اردو کی رفتیہ شاعری"، اردو اکیڈمی کراچی، اکتوبر ۱۹۷۶ء، ص ۳۰۔
- ۱۰۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، "اردو شاعری کا ارتقاء"، الو قاری پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۷ء، ص ۱۷۱۔
- ۱۱۔ محمد ذکریا خواجہ، اردو کی قدیم اصناف شعر، لاہور اکیڈمی، ص ۱۹۱۔
- ۱۲۔ عرفان شہزاد، ڈاکٹر، مضمون "سید مبارک شاہ" غیر مطبوعہ، ۲۰۱۵ء

باب چہارم

ماحصل

عصر حاضر انسان کی خالق سے قلبی بے تعلقی اور مادہ پرستی کی وجہ سے ایک پاگل خانہ کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ ایسے ماحول میں جسمانی بالیدگی اور نشوونما کے ساتھ ساتھ انسان کی روحانی نشوونما اور بالیدگی کی بھی اشد ضرورت ہے ورنہ انسان ترقی اور عروج کا دعویٰ محض کھوکھلا دعویٰ ہی رہ جائے گا اور اسی روحانی یا باطنی اصلاح کے متعلقات کو روحانیت اور تصوف کے نام سے موسوم کہا جاتا ہے۔ تصوف جبلت کو اخلاق بنا کر احساسات اور جذبوں کی تطہیر اور تہذیب کا اہتمام کرتا ہے۔

موجودہ دور کے افراد جن کے اذہان مغربی تہذیب اور مغربی تصورات سے متاثر ہو چکے ہیں۔ وہ تصوف کو ادب اور زندگی سے ہٹ کر کوئی اور یا نئی یا ممتاز چیز سمجھتے ہیں۔ وہ ادب کو اختراعی جبلت یا جمالیاتی جبلت سے جوڑتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ اخلاق یا مذہبی و دینی نظام پہلے سے ہی خالق کا خود کا بنایا ہوا نظام ہوتا ہے اس میں رد و بدل، تبدیلی تغیر یا تخلیق کا عنصر تقریباً ناپید ہوتا ہے بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔

اس کے برعکس ایک خیال یہ بھی جدید دور کی دین اور پیداوار ہے اور وہ یہ کہ جدید ادب نے دین کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اس کی نظر میں دل کی دنیا ہی دراصل ادب کی حقیقی اور اصل دنیا ہے حالانکہ یہ درست نہیں درحقیقت جو شعراء حقیقی شعراء ہیں اور دنیا نے انہیں قبولیت کے درجے پر فائز کیا انہوں نے دونوں یعنی دین اور دنیا یا ادب اور دین دونوں کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ بلکہ انہوں نے ادب کو تمام زندگی اور زندگی کے تمام شعبوں کا ترجمان بنایا ہے اور ان کا خیال ہے کہ حیات انسانی دراصل دین اور دل دونوں کے مجموعے سے عبارت ہے۔ اور ان کی مناسب ترکیب اور ارتباط ہی پر حیات انسان کی عمارت استوار ہے۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہو گا یہ دین اور دل ایک ایسے پر بت اور کہسار کی مانند ہیں جسے سر کرنے کے لیے انس، محبت، پیار اور خلوص کے جذبات کا سہارا چاہیے اور دین اور دل ایک ایسے سمندر کی طرح ہیں جس کو پار کرنے کے لیے محبت کی کشتی کی ضرورت پڑتی ہے کیوں کہ یہ محبت وہی حقیقی محبت ہے جس کی بناء پر دین کی عمارت استوار ہے۔

اگر ہم اپنے ماحول اور ارد گرد کا مشاہدہ کریں۔ تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس واقعاتی اور وجودی دنیا کی چیزیں ایک باطنی اور روحانی ربط کے باعث ایک دوسرے سے وابستہ اور جڑی ہوئی ہیں۔ اس دنیا کا حساس فرد یعنی شاعر اشیاء کے باطنی تعلق کو ظاہر کر کے واقعاتی دنیا کے وجود کو نئی، منفرد و یکتا و ممتاز وسعتوں سے روشناس کراتا ہے۔ ان وسعتوں کو ماپنے اور پرکھنے کے وہ اوزان اور پیمانے جو ہماری عقل کے مرتب کردہ ہیں اور وہ ہیں منطق، علم ہندسہ اور طبیعیات کے قوانین یہ ان وسعتوں کی پیمائش میں ہماری قطعاً مدد نہیں کر سکتے۔ لہذا ان کی پیمائش کرنے کے لیے ہمیں عقل و خرد کے پیمانوں کی بجائے وجدان کا سہارا لینا پڑے گا۔ ہر تخلیقی عمل وجدان اور قوتِ متخیلہ کا مرکب ہوتا ہے صوفی بھی وہ ہستی ہے جو شاعر کی طرح اشیاء کے باطنی اور روحانی رشتوں کو ڈھونڈ کر ان کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کرتا ہے اور ان اشیاء میں موجود ظاہری اختلاف کے ہوتے ہوئے ان کی روح میں حقیقتِ اولیٰ کو منعکس دیکھتا ہے۔

شاعر اور صوفی کے ہاں اشیائے کائنات دراصل علامتی حقائق کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہیں یوں آہستہ آہستہ یہ اشیاء باہمی و باطنی ربط کی وجہ سے باطنی وحدت کی حامل ہو جاتی ہیں اور اس کے ہمراہ وہ انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والی زندہ و جاوید حقائق کا روپ دھار لیتی ہیں۔

تخلیقی زندگی محض ادب اور شعر سے عبادت نہیں بلکہ یہ زندگی تو وہ ہے۔ جس میں انصاف و محبت، عقل و حسن، عشق و محبت اور احترامِ انسانیت کی اقدار ہوں اور خیر و نیکی کا مادہ بھی اس میں موجود ہو۔ اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ یہ کائنات بھی خیر کے وصف اور خیر کے ادراک کے بغیر ایک جہنم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور زندگی بد شکل اور بنجر ہو جاتی ہے۔

زندگی کی خوبصورتی، راعنائی اور اہمیت دراصل مثبت اقدار کی بدولت قائم رہتی ہے۔ اور یہ مثبت اقدار دراصل تصوف میں تعلم و تربیت کا حصہ ہیں۔ اس کی مثال ہم یوں لیں گے کہ صداقت ایک مثبت آفاقی قدر ہے اور یہ مثبت قدر اہل تصوف کے ہاں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے ادب کی اہمیت اور اولیت بھی دراصل مثبت اقدار کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور اسی ترجمانی کی وجہ سے ادب کو معاشرے میں پذیرائی اور اولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

تصوف کی دو قدریں: عشق اور ترک ہمارے اس معاشرے میں درخورِ اعتنا نہیں سمجھی جاتیں ہمارا معاشرہ عشق اور ترک کو بے عملی سمجھتا ہے کیوں ہمارا یہ معاشرہ احساس سے عاری اور خود غرضی کا شکار ہے۔ لیکن اگر مشاہدہ کیا جائے تو ہمیں اس حقیقت کا ادراک ہوتا کہ تصوف اور شاعری کی باطنی تنظیم کے بغیر عقلی

پیمانے پر تسخیر فطرت کا ثمر اور نتیجہ فطرت کی ہم سے بیزاری اور بغاوت کی صورت میں ظاہر ہوا ہے جبکہ تصوف اور شاعری نے داخلی رویہ اور سلوک کا مظاہرہ کرتے ہوئے زندگی سے اپنا تعلق اور رشتہ مضبوطی سے جواڑے ہے۔

اسی طرح نفس میں جھانکنے اور اس کا جائزہ لینے کے لیے پہلے اپنی طرف لوٹنا پڑتا ہے اور اگر دیکھا جائے تو فن اور تخلیق فن بھی اپنی جانب لوٹنے کا ایک عمل ہے۔ یعنی فن ایک وظیفہ ہے، اپنی جانب لوٹنے کا، واپسی اور مراجعت اختیار کرنے کا اور اپنے اندر کے اندھیرے، ان سنے اور ان کہے جہاں کی سیر کا ایک ذریعہ فن ہی ہے اور فن کار یا ادیب جتنا اپنے اندر کے جہاں کی تلاش میں زیادہ کامیاب ہو گا اتنا ہی بہترین تصور کیا جائے گا۔

وسعتِ قلب و نظر دراصل تخلیق کے لیے کلیدی حیثیت کی حامل صلاحیت ہے اور ہمیں تصوف میں بے تعصبی اور رواداری میں یہی وسعتِ قلب و نظر دکھائی دیتی ہے اور بعینہ تخلیق فن کرنے والا ادیب، شاعر اور فن کار جمالیاتی سطح پر قاری کو مسرت دینے کے ساتھ ساتھ اس کے دینی افق کو بھی کشادگی اور وسعت عطا کرتا جاتا ہے تاکہ قاری معانی کو ایک وسیع تناظر میں رکھ کر سمجھ سکے۔

یہ ساری کائنات کسی بے پایاں، لامحدود اور آن دیکھے مرکز اور نقطے کے گرد گھوم رہی ہے۔ اگر نظام شمسی کو دیکھیں تو چاند، ستارے، سیارے سب سورج کے گرد محو سفر ہیں اور یہ تمام سورج کے روشن ہالے کو چھو کر واپس سفر کا آغاز کر لیتے ہیں۔ اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ تمام اجرام اس روشن ہالے میں داخل کیوں نہیں ہو جاتے۔ تو اس کا جواب یہ ہو گا کہ نہیں ایسا نہیں ممکن ورنہ یہ تمام گردش کرنے والے اجرام جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ اگر یہ حدود سے تجاوز کے مرتکب ہوں گے۔ ان کی اپنی سیما ہے، اس کے اُس پار جانے میں اس کی عافیت نہیں۔ اس اصول کے برخلاف تصوف کے عقیدے کا قائل صوفی اس آگ میں بھسم ہونے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ دوسری جانب شاعر ہے جو طواف کا دلدادہ ہے۔ چھو کر، اور خود کو منور کر کے لوٹ جانے کا خواہاں ہوتا ہے تاکہ وہ بار بار اس لطف سے لطف اندوز ہو سکے اور یہ ذائقہ بار بار چکھ سکے اسے وصال سے زیادہ سعی مسلسل پسند ہے۔ اس کے برعکس صوفی قطرے میں دجلے کو دیکھتا ہے اور اسی میں جذب ہونا چاہتا ہے۔ فن کار اور ادیب اور شاعر جو دیکھتا ہے، جو محسوس کرتا ہے اسے الفاظ کا جامہ پہنا کر اشعار کے قالب میں ڈھال کر تمثیلوں اور صورتوں میں مجسم کر کے دکھاتا ہے جبکہ صوفی سورج کے ہالے میں داخل ہو کر سب کچھ خود دیکھنا چاہتا ہے اور اس طرح اس پر حالت صحر طاری ہو جاتی ہے اور پھر جب وہ

دیکھتا ہے تو اس رنگارنگ اور متنوع اشیاء سے بھرپور کائنات کے بارے میں عام ادیب سی کچھ دو قدم آگے بڑھ کر زیادہ اور بہترین صورتوں، تشبیہات اور استعاروں کو تخلیق دیتا ہے۔

تخلیق کے عمل کے لیے مکمل ارتکاز اور توجہ اور یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ذہن اور جسم کی رفتار میں موجود فرق یکسر مٹ جائے ختم ہو جائے اور یوں ذہن کا اضطراب اور بکھری ہوئی آرزوئیں، تمنائیں اور خواہشات سب ایک جگہ اکھٹی ہو کر رہیں، توجہ، یکسوئی اور ارتقار صوفی اور شاعر دونوں میں پایا جاتا ہے اور مماثلت کی صورت ہے اور صوفی کے ہاں تو یہ خود بخود پایا جاتا ہے جبکہ شاعری میں آورد سے کام لے کر اس کی موجودگی کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ اسی لیے صوفی آفاقی دنیا کا نقشہ آسانی سے کھینچ لیتا ہے۔

صوفی کی ہستی تصوف کی وجہ سے حقیقت اولیٰ کے حصول میں کامیاب ہو کر خود کو ہمکنار پاتا ہے اور یہ سب صوفی کے باطنی ربط کی وجہ سے ممکن ہو پاتا ہے۔ اسی بناء پر صوفی کا تجربہ، تجربہ اور بیان جامعیت کا حامل ہوتا ہے۔

تصوف، اخلاقیات کا حامل ہوتا ہے اور اگر دیکھا جائے تو اخلاق دراصل جمال ہی کا ایک روپ ہے اور جمال تخلیق کی بنیاد سمجھا جاتا ہے اور اسی طرح کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ مثبت اقدار جمال کی ایک صورت ہیں۔ ان اقدار کا فروغ دراصل جمالیات کا فروغ ہے۔

تصوف کائنات میں بکھری جمال اور اشکال کو باطنی ربط و تنظیم کے ذریعے ایک مرکزی ہالے میں داخل کرتا ہے۔ جبلت کو بااخلاق بنا کر جذبات کو مہذب کرنے کا کام سرانجام دیتا ہے۔

تصوف اور ادب کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا جہاں تک اردو ادب سے تصوف کے رشتے اور تعلق کی بات ہے تو یہ حقیقت ہے اور ان کا تعلق قدیم زمانے سے ہے اور انہیں الگ کرنا یہ ناممکن سی بات ہے۔ قدیم ادب کا ذکر اولین صفحات میں کیا تو پتا یہ چلا کہ ادب کے اولین شعراء اور ادیب مصنفین خود صوفی تھے۔ ان اولین شعراء میں شمالی ہند کے مشہور و معروف صوفی بزرگ شیخ فرید الدین گنج شکر اور گجرات کے شیخ باجن بڑی اہمیت کے حامل ہیں ان کے علاوہ خوب محمد چشتی، علی محمد جیو گام دھنی اور قاضی محمود دریائی جیسے نام گجراتی ادب کے ستون سمجھے جاتے ہیں۔ یہ چاروں صوفی منش تھے۔ اس دور کی خاص بات یہ ہے کہ اس دور میں تصوف تخلیق کے لیے بطور استعارہ استعمال ہوتا تھا۔ گجری زبان کو ترقی دے کر ان صوفیائے کرام نے قدیم اردو کی بہت خدمت کی، اسے ادبی صورت دی، جگری کی صنف گجری ادب میں اسی زمانے میں مقبول ہوئی۔ قدیم صوفی شعراء نے جگریوں کے ذریعے صوفیانہ ادب تخلیق کیا۔ اس کے علاوہ "خوب ترنگ" نامی کتاب

جس کے خالق خوب محمد چشتی تھے اس میں انہوں نے مولانا روم کی طرز پر حکایات کی صورت میں تمثیلیں بیان کی ہیں۔

بہمنی سلطنت دکن میں اردو ادب کی پہلی تخلیقی تجربہ گاہ تھا اور اس کی تشکیل میں صوفیانہ روایات کے مؤثر کردار سے انکار ناممکن ہے۔ اس دور میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی اہم تصنیف "چکلی نامہ" اہم ہے۔ اسی طرح بیجاپور کا ادب شاہ برہان الدین جانم، شیخ غلام اور شاہ امین الدین اعلیٰ کے بغیر گویا نامکمل ہے۔ اور یہ سب حضرات صوفیائے کرام کے کنبے سے تعلق رکھتے ہیں۔

فارسی ادب میں مولانا روم، حافظ شیرازی، عراقی اور سعدی کے نام اہم ہیں۔ فارسی غزل میں حافظ اور عراقی کے بغیر غزل کا ذکر نامکمل ہو گا۔ اردو ادب میں میر درد اور میر تقی میر کے بغیر غزل نامکمل ہے اور یہ سب صوفی شعراء ہیں اردو کی تمام اصناف بالخصوص غزل میں سے اگر تصوف اور مسائل تصوف کو منہا کر دیا جائے تو اردو ادب کا نصف سے زیادہ حصہ خارج ہو جائے گا کیوں کہ غزل میں انتہائی کثرت سے تصوف کے مضمون پر اشعار کہے گئے ہیں۔ تصوف کی وجہ سے اردو ادب کے نئے الفاظ، تلمیحات اور شاعری کا دامن وسیع تر ہوتا گیا۔ تصوف کی آمیزش نے عاشقانہ شاعری کے مزاج کی اصلاح و تطہیر کرتے ہوئے تصویرِ محبت کو بلند کیا اور اظہارِ محبت میں ادب و شائستگی اور وقار و متانت کا پہلو متعارف کرایا۔

صوفی شعراء نے قصیدہ گوئی کو خوشامد جیسی لعنت سے یکسر پاک کر کے اس کا خاتمہ کیا اور فلسفہ کو دخول ادب کرنا تصوف ہی کا کارنامہ ہے۔ اور انسان کو اس کے صحیح مقام و مرتبے سے آگاہ کرنا بھی تصوف ہی کا کام ہے۔ اہل تصوف کی ادب سے دلچسپی اور لگاؤ کی وجہ سے ہی حضرت امیر خسرو نے بہت بہترین اور قابل ذکر شہ پارے تخلیق کیے۔

ہماری ادبی اور فکری رویوں کی ابتداء حضرت امیر خسرو سے ہوتی ہے۔ ان کے صوفیانہ مسلک نے اس تاریخ کو موضوعات، طریق کار، تناظر اور سمت نمائی بخشی۔ مجنوں جذب و شوق کی علامت بن کر ادبی و فکری تاریخ میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اردو شاعری پر تصوف کی نوازشات اور احسانات کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب اور تصوف لازم و ملزوم ہیں یا ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ اردو شاعری روزِ ازل سے ہی تصوف کے آغوش میں پروان چڑھی اور پرورش پاتی رہی تصوف کی چاٹ اسے وراثت میں ملی۔ فارسی شاعری کی واردات و حقائق اور اصطلاحات اردو شاعری میں بھی گھل مل گئیں، بعض مواقع تو ایسے آئے کہ قصائد کی تشبیہات تک میں

معرفت کے مضامین انتہائی دلکشی اور کمال مہارت سے باندھے گئے۔ مختصر آئیہ کہ شاعری اپنے آہنگ و اطوار میں تصوف سی بہت زیادہ متاثر رہی ہے۔

الغرض تصوف ایک مضبوط تہذیبی ورثہ ہے اور جس کی عکاسی اور پر تو سے تحریر کلاسیکی انداز کی حامل ہو جاتی ہے، اور ادب کو جمالیاتی عروج اور ترویج عطا کرنے کے ساتھ ساتھ آفاقی حیثیت بھی عطا کرتی ہے۔ اردو شاعری میں تصوف ہی کی بدولت جسارت و بے باکی شامل ہوئی اور یہ باغیانہ بے ادبی کی صورت میں ظاہر نہیں ہوئی بلکہ نارِ عبودیت کا منفرد انداز لیے ظاہر ہوئی۔ بقول شبلی:

"وحدت الوجود کا مسئلہ سر تا پا شاعری ہے۔"

تصوف کی تعلیمات کا ایک اصول رازداری ہے۔ اس پر سے اردو شاعری نے "اخفائے راز" کا گراور رمزیت کی ادا سیکھی، زندگی کے مراحل مثلاً جمالیاتی، اخلاقی اور مذہبی مرحلہ دراصل یہی مراحل تصوف کا بھی لازمہ ہیں اور ان کی تکمیل تصوف میں ہی ہوتی ہے۔

ابدیت سے ہم کنار ہونے کے لیے تکمیل حیات ضروری ہے اور اس حیات کا ترجمان ادب ہی آفاقی یا کلاسیکی ادب ہو گا۔ ایسے ادب کے خالق کے دماغ میں روحِ عالم سمٹ آتی ہے اور وہ پھر اپنی قوت متخیلہ کی مدد سے تخلیق کے عمل کی تکمیل میں کامیابی حاصل کرتا ہے کیونکہ اگر دیکھا جائے تو تخلیق کے عمل کو وجود میں آنے کے لیے عقل اور تخیل کے نازک، ہلکے اور حقیف سے تعامل، ربط اور اختلاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ وجودی صورت حال کو فنکارانہ اور ماہرانہ پیرائے سے ملبوس کرنے کے لیے خلقی ضرورت کو صوفی کا تخیل پورا کرتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ کہ فن یا آرٹ کی سمجھ بوجھ یا فہم اس کو ہوتی ہے۔ جو خود اپنے آپ اور اپنی ذات کو جانتا ہو اور خود اپنے نفس کی گہرائیوں سے باخبر اور واقف ہو تو پھر صوفی سے بڑھ کر کون اپنے نفس کے نہاں خانوں سے واقف، باخبر اور آگاہ ہو سکتا ہے۔

عام طور پر لوگوں کا خیال یہ ہوتا ہے کہ ایسے افراد جو حکومتی عہدے دار ہوتے ہیں اور اچھے مرتبے پر فائز ہوتے ہیں۔ ان کی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہوتی ہیں اور ان بے شمار ذمے داریوں کی انجام دہی کی وجہ سے انہیں تخلیقی اور فکری کام کرنے کے لیے مناسب وقت دستیاب نہیں ہوتا اور یوں بہت ساری فنی و فکری صلاحیتوں کے حامل افراد اپنی صلاحیتوں سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھاتے اور ذمہ داریوں میں الجھ کر تخلیقی عمل اور تخلیقی ادب کے عمل سے کوسوں دور رہتے ہیں لیکن اس عام تاثر کو غلط ثابت کرنے کے لیے بہت سارے ایسے نام ہیں جو اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ معجزہ فن کی نمو میں اپنا حصہ ڈالتے رہے ہیں۔

اس سلسلے میں سید مبارک شاہ کا نام بجا طور پر لیا جاسکتا ہے۔ وہ سول سروس میں خدمات کی بجا آوری کے ساتھ تخلیقی صلاحیتوں کا استعمال بھی کرتے نظر آتے ہیں۔

"جنگل گمان کے" سے لے کر زندگی کے آخری دور تک سید مبارک شاہ کا شعری اور تخلیقی سفر درجہ بدرجہ ارتقائی شکل لے کر ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے۔ انہوں نے اس تخلیق کے سفر میں زندگی کی مختلف جہات کو اپنے معجزہ فن کے سہارے بے نقاب کیا اور اس فن کے نتیجے میں جوشہ پارے وجود پذیر ہوئے ان میں ان کی شخصیت اور فکری نظام کے تمام رنگ پوری آب و تاب لیے جلوہ گر ہوئے ہیں ان رنگوں کو منظر عام پر لانے کی انہوں نے کوئی شعوری سعی نہیں کی بلکہ یہ سب کچھ تو خود کار طریقے سے ہوتا گیا۔ کیونکہ خیال، جذبہ اور احساس کی نوعیت خود بخود اظہار کے وسیلوں کا تعین کرتی چلی جاتی ہے۔

سید مبارک شاہ کے کلام میں ان کی غزلیات سطحی جذبات کی بجائے فکری و معنوی لحاظ سے وسعت و گہرائی کی حامل ہیں۔ ان کی فکر پر اپنے پیش رو شعراء خصوصاً اقبال اور حسین بن منصور کے اثرات ملتے ہیں لیکن انہوں نے اثر ضرور کیا مگر رنگ و آہنگ اور انداز ان کا اپنا ہے۔ موضوعات کی یکسانیت و تکرار کہیں قاری کو محسوس ہوتی ہے۔ مگر وہ چھن نہیں محسوس کرتا بلکہ اس کیفیت سے سید مبارک شاہ کی ذات کی توانائی اور ان کے مشاہدے کی گہرائی کا احساس قومی ترہو کے اجاگر ہوتا ہے۔ اور ان کے معاصرین میں ان کی انفرادیت اور امتیاز کی وجہ بھی ان کی ہمہ جہت شخصیت ہی ہے۔

سید مبارک شاہ نے اردو شاعری کے موضوعات کے انتخاب میں تنوع سے کام لیا ہے اور اس بنا پر اردو شاعری میں ایک نئی روش کی طرح ڈالنے والے بن گئے ہیں۔ اور یہ انفرادیت صرف اور صرف انہیں سے مخصوص ہے، ان کے دور کے دیگر شعراء اس سے دور نظر آتے ہیں۔

سید مبارک شاہ کے ہاں تمام تر تخلیقی کام محض اور محض سطحیت کا حامل نہیں بلکہ ان کے ہاں تمام تر تخلیق ذاتی تجربے اور واردات قلبی کی بناء پر وجود میں آئی۔ انہیں کہی سنی باتوں کو بار بار سنانے اور بیان کرنے کا قطعاً شوق نہیں وہ تصوف کے معاملے میں بھی محض روایت کی پاسداری نہیں کرتے نظر آتے بلکہ اپنی خود کی احساسات اور جذبات اور تجربات کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ روایتی متصوفین ان سے اختلاف کرتے نظر آتے ہیں۔ اس اختلاف کا ہونا ایک فطری امر ہے کیوں کہ ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے کہ جب کوئی تدبر و تفکر کی راہ اپنا کر جدت کو اپناتا ہے تو اس کے مخالفین اچانک سامنے آجاتے ہیں۔ جبکہ قرآن نے تو تدبر، تفکر اور بصیرت کے استعمال کی دعوت دے کر انسان کے لیے نئی راہیں تلاش کرنے کی جستجو کی

ہے اور اس کے برخلاف ادب کے روایتی مضامین پر طبع آزمائی کرنے والے سید مبارک شاہ کی جدت ادا اور جدت انتخاب مضامین کو اختلاف کی بھینٹ چڑھا کر ان کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں لیکن سید مبارک شاہ نے تدبر و تفکر کی دعوت قبول کر کے جدید راہوں کا راہی بننے کی جسارت کی ہے اسی لیے اس سفر میں وہ تنہا نظر آتے ہیں خود ایک جگہ وہ یوں رقمطراز ہیں:

مجھے تم کسی کے عقب میں نہیں پاؤ گے
اور مری گرد کوئی نہیں پاسکے گا

(مدارِ نارسائی میں، ص: ۵۰۷)

سید مبارک شاہ کی شاعری کا مرکزی اور بنیادی موضوع خدا اور انسان کا تعلق ہے۔ انہوں اس تعلق کی تفصیل اپنے کلام میں جس طرح اور جس انداز میں پیش کی وہ تعلق محض معاشرتی نوعیت کا حامل نہیں بلکہ وہ تعلق اور اس کی نوعیت ذاتی اور جذباتی ہے انبیائے کرام علیہم السلام جو وقتاً فوقتاً اس دنیا میں تشریف لاتے رہے ان سب کا مقصد ایک ہی تھا کہ مخلوق اپنے خالق کو جان لے اور اس کا قرب حاصل کر سکے اور یہی دراصل ان کا (مخلوق کا) مقصد حیات بھی تھا۔ لیکن بعد میں جو دیگر لوگ ان ہستیوں کے درمیان آئے انہوں نے بجائے تعلق مضبوط کرنے کے اس میں رخنہ ڈال دیا اور تعلق جو بندے کا خدا سے ہونا چاہیے تھا وہ کمزور پڑتا گیا اور اس میں کھوٹ شامل ہو گئی اور انسان محض دکھاوے کی عبادت اور تعریف کر کے تھکنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکا۔ سید مبارک شاہ کے ہاں اس کھوٹ کی گنجائش نہیں انہوں نے اپنے کلام میں جا بجا اس سے بیزاری کا اظہار کیا ہے بلکہ اس منافقت اور کھوکھلے ایمان کو قابل سزا کہا ہے وہ یوں رقمطراز ہیں:

بتا ان اہل ایمان کی سزا رکھی ہے کیا تو نے
خداوند! جو تجھ کو احتیاطاً مان لیتے ہیں

(مدارِ نارسائی میں، ص: ۴۰۹)

وہ یہ کہتے ہیں کہ انسان نے کبھی شرک کیا ہی نہیں بلکہ وہ ہر جگہ دراصل اللہ کو ہی مانتا رہا ہے لیکن اس کے سامنے جو بھی وجود آیا اس نے اسے اللہ سمجھ کر سجدہ کیا وہ یوں رقمطراز ہیں:

انسان کسی بھی دور میں مشرک کبھی نہ تھا
پتھر کے نام پر بھی تجھے پوجتا رہا

(جنگل گمان کے، ص: ۷۸)

کسی سے سچا اور کھرا تعلق اور رشتہ وہ سمجھا جاتا ہے جس میں لالچ نہ ہو۔ تصوف کے پیرو صوفیا بھی سزا و جزا کے خوف اور لالچ سے بالاتر ہو کر محبت الہی کا درس دیتے ہیں اور یہی درس سید مبارک شاہ کا کلام میں ہمیں نظر آتا ہے وہ یوں رقمطراز ہیں:

جنت کی ہوس جن کی اطاعت کا سبب ہے
ان کے لیے کم پڑتی ہے دوزخ کی سزا بھی

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۱۹۲)

دعا کو انسان اور خدا کے تعلق میں بنیادی حیثیت حاصل ہے اور عام طور پر رونے، گڑ گڑانے اور گھسے پٹے، رٹے ٹائے جملوں کی ادائیگی ہی ابھی تک مروج چلی آرہی ہے اور اسی طریقے کو دعا کا نام دیا جاتا ہے لیکن سید مبارک شاہ کے ہاں دعا کا تصور کچھ یوں ہے:

خدا کو آدمی سمجھا ہے تو نے
جو ایسے گڑ گڑا کر مانگتا ہے
جھٹک دیتا ہوں ہاتھوں کو اٹھا
مجھے وہ مجھ سے بہتر جانتا ہے

(مدارِ نارسائی میں، ص: ۲۸، ۵۲)

قیامت کے حوالے سی بہت سے شعراء نے طبع آزمائی کی ہے اور سب نے اس منظر کو اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے اور سب نے نفسا نفسی، عذاب، ثواب، جہنم و جنت کا بیان اپنے اپنے انداز میں کیا ہے لیکن سید مبارک شاہ نے اس محشر کے پپا ہونے کو دراصل دیدارِ محبوب کا ایک موقع کہا ہے وہ یوں رقمطراز ہیں:

ایک حشر بھی ہو گا قیامت کے دن پپا
انسان لپٹ کے روئے گا پروردگار سے

(جنگل گمان کے، ص: ۴۳)

سید مبارک شاہ کا اندازِ مخاطب سب سے منفرد و ممتاز ہے وہ انتہائی بے باکی سے وارفتگی کا اظہار کرتے ہوئے اور شدتِ جذبات کے ہاتھوں کچھ اس انداز سے خدا سے مخاطب ہوتے ہیں کہ ان کے زمانے کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں اس کی مثال ناپید ہے۔ البتہ جن ہستیوں کا انہوں نے اثر قبول کیا ان کے ہاں بھی اس قسم کے انداز کی مثالیں ملتی ہیں ان میں اقبال حسین بن منصور حلاج، بلھے شاہ شامل ہیں۔ "جنگل گمان کے" کی نظموں "الم ترکیف" اور بابیلیس مقید ہیں "میں اقبال کے انداز میں شکوہ اور جواب شکوہ" کا تاثر ملتا ہے۔ وہاں وہ ایسے سوالات بھی کرتے نظر آتے ہیں جو زمانے کے فلسفیوں کے اذہان میں گردش کر رہے تھے لیکن "شکوہ اور جواب شکوہ کے تناظر میں اگر سید مبارک شاہ کے کلام کو دیکھا جائے تو وہاں شکوہ کرنے والا جواب پالیتا ہے اور سید مبارک شاہ کے ہاں بات سوالیہ نشان پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔

جس طرح قرآن میں انسان کو موضوع بحث بنا کر اسے اپنی ذات پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور یہ شرط رکھ دی ہے کہ اگر خدا کو جاننا ہے تو پہلے خود اپنے آپ کو جان تو، قرآن کہتا ہے:

من عرف نفسه فقد عرف ربه

یعنی عرفانِ رب کا سفر عرفانِ نفس کے بغیر شروع ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر عرفان ایسی کیفیت ہے کہ یہ وسعتِ نظر کے بغیر ممکن نہیں چاہے یہ عرفان خود ہی کا ہو یا رب کا۔ اسی موضوع کو انہوں نے اپنی ایک نظم "ہم اپنی ذات کے کافر" میں بیان کیا ہے کہ انسان انتہائی کم فہم ہے وہ اس ذات تک رسائی کیسے اور کیوں کر حاصل کر پائے گا۔ جب کہ وہ خود اپنے آپ تک کو پہچان نہیں پارہا۔ ان کی دیگر نظموں "کوہِ ندا" میں بھی اسی موضوع کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

سید مبارک شاہ کے پسندیدہ موضوعات میں الہیات کے مسائل بھی ہیں ان مسائل کے حل کرنے اور نبھانے میں وہ ہمہ جہت شخصیت بن کر ابھرتے ہیں۔ وہ بیک وقت عاشق، صوفی، متکلم اور شاعر کے طور پر بات کرتے ہیں یوں ان کلام میں یہ چار حیثیات اور یہ چاروں پہلو ہمیں ہر کہیں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ معاملات کی نزاکت کے بیان میں شاعریوں یوں رقمطراز ہیں:

الجھا ہوا خدا بھی ہے دامِ دوام میں

ہے سلسلہ حدود سے باہر قیود کا

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۱۹۰)

الہیات سے دلچسپی کے باوجود سید مبارک شاہ انسانیت کے قدردان ہیں، انسان مظہر صفات تو ہے مگر اس کے بارے میں سید مبارک شاہ یوں رقمطراز ہیں:

آدم کی کسی روپ میں تحقیر نہ کرنا
پھرتا ہے زمانے میں خدا بھیس بدل کر

(جنگل گمان کے، ص: ۴۷)

سید مبارک شاہ کے کلام میں گوتم بدھ، سقراط، امام حسین اور ابن منصور حلاج کا ذکر بار بار ملتا ہے گوتم بدھ کے لیے لکھی گئی ان کی نظم "برگد کی دھوپ میں" خاص طور پر قابل ذکر ہے سقراط کے لیے نظم "لکھنے والو کیا لکھو گے؟" اور "معذرت" بھی خاص چیز ہے اسی طرح نظم "کربلا کے بعد" میں امام حسینؑ کا ذکر ملتا ہے تاہم وہ تاریخ کی واحد شخصیت جس سے شاہ جی سب سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں وہ منصور حلاج ہے۔ قرآن کے بعد منصور حلاج ہی ان کی شاعری کا اہم ستون ہے۔

تاریخی شخصیت کے علاوہ دور حاضر کے با اصول افراد سے بھی متاثر نظر آتے ہیں اور اپنے کلام میں جابجا ان کا ذکر کرتے ہیں۔ نظم "تنسیخ" میں افراد کا ذکر ہے جو زمانے کی آب و تاب سے متاثر نہیں ہوتے اور اپنے اپنے اصولوں کے مطابق کاروبار حیات کرتے جاتے ہیں۔

سید مبارک شاہ جیسے دقیق نظر اور تحقیق کرنے والے فرد کا یا شاعر کا معاصر فلسفیانہ، ادبی اور سائنسی رویوں سے متاثر ہونا ایک فطری بات ہے مگر واضح طور پر وہ کسی خاص تحریک سے وابستہ نظر نہیں آتے۔ ان کے کلام میں معنویت، جدیدیت، موجودیت، اور مابعد جدیدیت کی مثالیں ملتی ہے "کتاب ہم اپنی ذات کے کافر" کی نظمیں "دریافت" ایک مسافت زدہ سوال، "لمحہ موجود"، اور کتاب "مدارِ نارسائی میں" کی نظمیں "سوچتا ہوں"، "ہم آدمی ہیں"، "مدارِ نارسائی"، اور "ایک مسافت نامہ" وغیرہ اس کی چند مثالیں ہیں۔ ان نظموں میں انسان اور اس کے بارے میں اذہان میں اٹھتے ہوئے اُس وجود اور عدم وجود کے سوالات کا ذکر ہے جس کو مذہب، فلسفہ اور سائنس تینوں کھوج رہے ہیں اور سید مبارک شاہ ان تین راہوں کے باقاعدہ مسافر ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں سوال کی بجائے جوابات دیئے ہیں اور اپنی انتہائی اہم نظم "وسخر لکم الا نھار" (مدارِ نارسائی میں) انسان کی موجودیت اور کائنات میں اس کے مقام و مرتبے کے حوالے سے سوالات کے جوابات دیتے ہیں۔ سید مبارک شاہ کے کلام میں معاشرے میں موجود ظلم و بے انصافی پر رنجیدگی کے

جذبات کا بیان بھی جا بجا نظر آتا ہے نظم "جشن" (جنگل گمان کے) اور "بلا جواز" (ہم اپنی ذات کے کافر) میں اس نا انصافی اور غیر معاشرتی رویوں پر صدائے احتجاج ہیں۔

عز زمین خور لوگ رزق خاک کیوں نہیں ہوئے؟

اور ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں:

بے خوف ہو کے فرد کی تذلیل کیجیے
اتنے شدید جرم کی کوئی سزا نہیں

(ہم اپنی ذات کے کافر، ص: ۱۸۰)

سید مبارک شاہ کیوں کہ ایک افسر تھے اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی بھی بطریق احسن کرتے رہے مگر ان کے ساتھ ساتھ اپنے اندر کے حساس شاعر کو بھی زندہ رکھا اور فائلوں اور سرخ فیتوں میں اسے دفن نہیں کیا بلکہ اس دوران پیش آنے والے واقعات و تجربات کو جمالیات کے اچھوتے سانچے میں ڈھال کر امر کر دیا اس حوالے ان نظمیں "ڈکٹیشن"، "بیورو کر لسی"، "اور تیس جون" قابل ذکر ہیں۔

سید مبارک شاہ کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے نہ صرف زندگی کی تلخیوں اور تلخ حقائق کو جانا، پہچانا بلکہ انہوں نے ان حقائق سے قارئین کو آگاہ بھی کیا۔ گویا بصارت سے عاری نور سے عاری اس دنیا میں جہاں جمال حقیقت اس قدر گہرائی میں پوشیدہ اور محبوب ہے کہ عام نظر اسے نہ دیکھ سکتی نہ سمجھ سکتی اور نہ ہی وہاں تک حقیقی رسائی حاصل کر سکتی ہے تو وہاں تک سید مبارک شاہ نے قارئین کو لے کر جا کر اصل حقائق سے روشناس بھی کرایا اور اپنے فرض منصبی کو جانتے ہوئے نہ صرف خود کو ان سب سے روشناس کرایا بلکہ وہ جان گئے کہ جاننا ہی نہیں بتانا بھی ہے اور دیکھنا ہی نہیں دکھانا بھی ہے اور یہی ایک انسان کے فرائض میں شامل ہے، وہ یوں رقمطراز ہیں:

ہمیں وہ ذائقہ چکھ کر بتانا ہے
جو چکھیں تو بتایا جا نہیں سکتا
مگر ہم نے بتانا ہے

کہ لمحے جاں کنی کے زندگی پر کیسے جیتے ہیں
تو آؤ مرگِ دوراں میں ابھی کچھ دیر جیتے ہیں

(مدارِ نارسائی میں، ص: ۳۹۹)

ڈاکٹر وحید احمد نے اپنے اور سید مبارک شاہ کے درمیان لفظ کی بناء پر تعلق کا ذکر کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ اکثر ملتے تھے اور زیادہ دیر تک صحبت رہتی تھی۔ ان کے بارے میں وہ کہتے ہیں وہ سیماب صنف انسان تھے اور یہ سب اس لیے کہ ہر شاعر شائد کسی دوسرے سیارے کا فرد ہوتا ہے اس کا رویہ عامیوں جیسا ہوتا ہی نہیں ان کے ہاں ہر بات اور ہر موقعہ پر ان کی بات کی جاتی ہے۔
مجید امجد سید مبارک شاہ کے بارے میں اخبار نوائے وقت میں ان کی وفات پر ایک مضمون میں کہتے ہیں۔

وہ ایک صاحبِ دل، صاحبِ نظر اور صاحبِ فکر آدمی تھے۔ شاہ جی کا کلام حقیقت کا ایک سلسلہ ہے جس سے ہماری بہت سی مشکلات حل ہوئی ہیں۔ شاہ جی کے کلام نے ہمیں سوچ، نظریے، عقیدے اور محبت کا حقیقی رخ دیا۔ وہ کہتے ہیں:

آزاد کر خدا کو خداؤں کی قید سے
سارے بتانِ مسلکِ نفرتِ تباہ کر

مضمون از ڈاکٹر عرفان

وہ سید مبارک شاہ اور ان کی شاعری کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ان کے اکثر اشعار نے مجھے چونکا کر بلکہ ہلا کر رکھ دیا۔ ان کی شاعری میں مجھے اپنے دے، تلملے ہوئے خیالات اور جذبات کا پر تو نظر آیا۔ وہ جو میں سوچتے ہوئے بھی گھبراتا تھا وہ ان کے ہاں مسطور بلکہ منظوم موجود تھا۔ ان کا شعر
بتانِ اہل ایمان کی سزا رکھی ہے کیا تو نے
خداوند جو تجھ کو احتیاطاً مان لیتے ہیں
تو میرا وردِ زبان بن گیا ہے۔

ب: نتائج:

اس مقالے کی تحریر سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے اس حوالے سے یہ کہنا بجا ہو گا کہ اس میں تصوف کے آغاز اس کے حوالے سے اردو شاعری کی تاریخ اور روایت اور پھر دور جدید میں شعراء کا اور خاص طور پر سید مبارک شاہ کا اس رنگ میں شاعری تخلیق کرنا جیسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ایک ادنیٰ سی سعی کی جسارت کی گئی ہے۔ تصوف کے آغاز کے سلسلے میں یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ اس کا آغاز آنحضرت ﷺ کی ذات سے ہوا۔ اور اس بات پر جملہ علماء اور صوفیا متفق نظر آتے ہیں۔ آپ کو صوفی اعظم کیا گیا کہ آپ کی حیات مبارکہ مکمل طور پر قرآن کی تعلیمات کا عملی نمونہ تھی یہی وجہ رہی کہ تصوف کی بعض بنیادی باتیں یا شرائط آپ کی ذات میں موجود تھیں۔

اسی طرح اردو ادب پر تصوف کی نوازشات اور احسانات کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب اور تصوف لازم و ملزوم ہیں اور یہ کہ تصوف ہمارا تہذیبی ورثہ ہے۔

اس مقالے میں سید مبارک شاہ کے کلام میں تصوف کے عناصر کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کے دوران ہم پر یہ عقدہ وا ہوا کہ ان کے کلام میں نہ صرف تصوف کی کار فرمائی نظر آتی ہے بلکہ یہ ان کے اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر تخلیق شدہ کلام ہے۔

ان کے کلام میں مشاہدے کی گہرائی نظر آتی ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل انسان تھے اور اردو شاعری میں ان کے ہاں موضوعات کا تنوع بھی جلوہ گر نظر آتا ہے اور یہی ان کے کلام کا خاصا ہے اور ان کی شخصیت کا بھی۔ سید مبارک شاہ کا تمام تخلیقی کام ان کے ذاتی تجربے اور واردات قلبی کی بناء پر وجود میں آیا۔ تصوف کے معاملے میں بھی وہ روایت کی پاسداری کی بجائے ذاتی جذبات و احساسات و تجربات کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔

تصوف کے علاوہ سید مبارک شاہ کے کلام میں معاشرتی جبر، ظلم، نا انصافی اور عدم مساوات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے اور انتہائی خوبصورتی اور منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ سید مبارک شاہ نے قارئین کو ان معاشرتی مسائل اور ان موضوعات سے نہ صرف متعارف کروایا بلکہ بطریق احسن انہیں ان کی سنگینی اور اہمیت کا احساس دلایا ہے۔

ج: سفارشات:

- ۱۔ زیر نظر تحقیق میں تصوف کے حوالے سے سید مبارک شاہ کے کلام کا جائزہ لیا گیا۔ ان کے کلام کی فنی اور فکری دونوں انداز کی تحقیقی ممکن ہے۔
- ۲۔ سید مبارک شاہ کے کلام میں تنوع کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ تنوع مضامین کا بھی ہے اور فکر کا بھی دونوں موضوع تحقیق کے لیے بہترین انتخاب ثابت ہو سکتے ہیں۔
- ۳۔ سید مبارک شاہ کی کلیات پر بھی تحقیقی اور تنقیدی کام ہو سکتا ہے۔
- ۴۔ سید مبارک شاہ کے کلام کو مابعد جدید تناظر میں بطور تحقیقی موضوع منتخب کیا جاسکتا ہے۔
- ۵۔ سید مبارک شاہ کی شاعری کی تمام کتب کو انفرادی لحاظ سے بھی موضوع تحقیق بنایا جاسکتا ہے۔ ان تمام کتب میں متنوع موضوعات پر نظمیں اور غزلیات موضوع تحقیق کے لیے مناسب مواد ثابت ہو سکتی ہیں۔
- ۶۔ سید مبارک شاہ کے کلام میں حصہ غزل کو انفرادی طور پر تحقیق کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

- ۱۔ مبارک شاہ سید، "جنگل گمان کے" ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۳ء
- ۲۔ مبارک شاہ سید، "کلیات سید مبارک شاہ"، بک کارنر جہلم، ۲۰۱۷ء
- ۳۔ مبارک شاہ سید، "ہم اپنی ذات کے کافر"، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۹۵ء
- ۴۔ مبارک شاہ سید، "مدارِ نارسائی میں" الرزاق پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۸ء

ثانوی ماخذ:

- ۱۔ اختر انصاری، "غزل کی تعلیم" ترقی اردو بورڈ لاہور، ۱۹۷۹ء۔
- ۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، "اردو ادب کی تحریکیں"، انجمن اردو پاکستان کراچی، ۱۹۹۴ء۔
- ۳۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، "کشاف تنقیدی اصطلاحات"، ادارہ فروغِ قومی زبان، وزارتِ اطلاعات و نشریات، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء۔
- ۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر "پاکستان کی نئی نظم پر گفتگو"، مشمولہ پاکستانی ادب، جلد اول، فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج راولپنڈی، ۱۹۸۱ء۔
- ۵۔ رضا حیدر، ڈاکٹر، "اردو شاعری میں تصوف اور روحانی اقدار"، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء۔
- ۶۔ رفیع الدین اشفاق، سید، "اردو کی شاعری"، اردو اکیڈمی کراچی، اکتوبر ۱۹۷۶ء۔
- ۷۔ سید صفی حیدر دانش، پروفیسر، ایم اے، "تصوف اور اردو شاعری"، سندھ ساگر اکادمی، ۱۹۴۸ء۔
- ۸۔ سید اعجاز حسین اعجاز، ایم اے، "آئینہ معرفت یعنی اردو شاعری میں تصوف"، لالارام نرائن لعل بک سیلر، کڑہ روڈ الہ آباد، ۱۹۳۲ء۔
- ۹۔ عطش درانی، ڈاکٹر، "اردو اصناف کی مختصر تعریف"، میری لائبریری طبع دوم، ۲۰۰۸ء۔
- ۱۰۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، "اردو شاعری کا ارتقاء"، الو قار پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء۔
- ۱۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، "تاریخ جدید اردو غزل"، اسلام آباد بک فاؤنڈیشن، طبع اول ۱۹۸۸ء۔
- ۱۲۔ فقیر احمد، پروفیسر، "ہماری شاعری"، پاپو لری بلیشنگ ہاؤس، ۱۹۹۱ء۔

۱۳۔ محمد زکریا خواجہ، "اردو کی قدیم اصناف"، لاہور۔

۱۴۔ محمد عبدالنصیر بن عبدالبصیر علوی (مترجم)، "تصوف کا انسائیکلو پیڈیا"، مکتبہ رحمانیہ، اقراسنٹر، غزنی
سٹریٹ اردو لاہور، ۳۵۶ھ تا ۳۶۵ھ۔

مقالہ جات:

- ۱۔ سلمیٰ کبریٰ، "اردو رباعی میں تصوف کی روایت ۱۹۳۶ء تک" مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی، کلکتہ یونیورسٹی، سن۔
- ۲۔ سعدیہ عاشق، "سید مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ"، مقالہ برائے ایم۔ اے، نمل یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۱۶ء۔

اخبار:

- ۱۔ روزنامہ ایکسپریس، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، راولپنڈی، کراچی۔

لغات:

- فیروز لغات، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، راولپنڈی، کراچی۔

ویب سائٹس:

- ۱۔ مابعد الطبیعات، آزاد دائرہ المعارف،
<https://ur.m.wikipedia.org/wiki>
- ۲۔ مابعد الطبیعات، منصور آفاق،
<https://mansoorafaq.com>
- ۳۔ مابعد الطبیعات،
<https://mansoorafaq.com>
- ۴۔ مابعد الطبیعات، احمد ہمیش،
[https://www.rekhta.org/nazmsmaq_bac Rekhta](https://www.rekhta.org/nazmsmaq_bac_Rekhta).